شیعہ جواب دیتے ہیں

سید رضا حسینی نسب

مترجم: عمران مہدی

مجمع جہانی اہل بیت علیہم السلام

فہرست

حرف اول.....۱۱

پیش گفتار.....۱۵

پہلا سوال: ''وعترتی اہل بیتی'' صحیح ہے یا ''وسنتی''؟.....۱۹

دوسرا سوال: شیعہ سے کیا مراد ہے؟.....۳۵

تیسرا سوال: کیوں حضرت علیؑ ہی پیغمبرؐ کے وصی اور جانشین ہیں؟.....۳۹

چوتھا سوال: ''ائمہ'' کون ہیں؟.....۴۵

پانچواں سوال: حضرت محمدؐ پر صلوات پڑھتے وقت آل کا اضافہ کیوں کرتے ہیں اور اللھم صلّ علی محمد وآل محمد کہتے ہیں.....۴۹

چھٹا سوال: اپنے اماموں کو معصوم کیوں کہتے ہیں؟.....۵۱

ساتواں سوال: اذان میں اشھد ان علیًا ولی اللہ کیوں کہتے ہیں اور حضرت علی۔ کی ولایت کی شہادت کیوں دیتے ہیں؟.....۵۵

آٹھواں سوال: مہدی آل محمد کون ہیں اور ان کا انتظار کیوں کیا جاتا ہے؟.....۵۹

نواں سوال: اگر شیعہ حق پر ہیں تو وہ اقلیت میں کیوں ہیں اور دنیا کے اکثر مسلمانوں نے انہیں کیوں نہیں مانا؟.....۶۳

دسواں سوال: رجعت کیا ہے اور آپ اس پر کیوں عقیدہ رکھتے ہیں؟.....۶۷

گیارہواں سوال: جس شفاعت کا آپ عقیدہ رکھتے ہیں وہ کیا ہے؟.....۷۵

بارہواں سوال: کیا حقیقی شفاعت کرنیوالوں سے بھی شفاعت کی درخواست کرنا شرک ہے؟.....۸۱

تیرہواں سوال: کیا غیر خدا سے مدد مانگنا شرک ہے؟.....۸۷

چودہواں سوال: کیا دوسروں کو پکارنا ان کی عبادت ہے؟.....۹۱

پندرہواں سوال: ''بداء'' کیا ہے اور آپ اس کا عقیدہ کیوں رکھتے ہیں؟.....۹۹

سولہواں سوال: کیا شیعہ قرآن مجید میں تحریف کے قائل ہیں؟.....۱۰۵

سترہواں سوال: صحابہ کرام کے بارے میں شیعوں کا کیا نظریہ ہے؟.....۱۱۹
اٹھارہواں سوال: متعہ کیا ہے اور شیعہ اسے کیوں حلال سمجھتے ہیں؟.....۱۳۱
انیسواں سوال: شیعہ مٹی پر کیوں سجدہ کرتے ہیں؟.....۱۴۳

بیسواں سوال: شیعہ زیارت کرتے وقت حرم کے دروازوں اور دیواروں کو کیوں چومتے ہیں اور انہیں باعث برکت کیوں سمجھتے ہیں؟.....۱۵۵
اکیسواں سوال: کیا اسلام کی نگاہ میں دین سیاست سے جدا نہیں ہے؟.....۱۶۱
بائیسواں سوال: شیعہ، حضرت علی ابن ابی طالب کے بیٹوں (امام حسن اور امام حسین ۲۲۸) کو رسول خداؐ کے بیٹے کیوں کہتے ہیں؟.....۱۷۱
تیئیسواں سوال: شیعوں کے نزدیک یہ کیوں ضروری ہے کہ خلیفہ کو خدا اور رسولؐ ہی معین فرمائیں؟.....۱۷۹
چوبیسواں سوال: کیا غیر خدا کی قسم کھانا شرک ہے؟.....۱۸۵
پچیسواں سوال: کیا اولیائے خدا سے توسل کرنا شرک اور بدعت ہے؟.....۱۹۳
چھبیسواں سوال: کیا اولیاء خدا کی ولادت کے موقع پر جشن منانا بدعت یا شرک ہے؟...۲۰۱
ستائیسواں سوال: شیعہ پانچ نمازوں کو تین اوقات میں کیوں پڑھتے ہیں؟.۲۰۷
اٹھائیسواں سوال: شیعوں کی فقہ کے ماخذ کون سے ہیں؟.....۲۲۹
انتیسواں سوال: کیا ابو طالب ایمان کیساتھ دنیا سے گئے ہیں کہ آپ انکی زیارت کیلئے جاتے ہیں؟.....۲۴۵

تیسواں سوال: کیا شیعوں کی نظر میں جبرئیلؑ نے منصب رسالت کے پہنچانے میں خیانت کی ہے اور کیا یہ صحیح ہے کہ انہوں نے حضرت علی۔ کے بجائے قرآن مجید کو رسول اکرمؐ پر نازل کر دیا ہے؟.....۲۷۳
اکتیسواں سوال: تقیہ کا معیار کیا ہے؟.....۲۷۹
بتیسواں سوال: ایران کے بنیادی قانون میں کیوں مذہب جعفری (اثنا عشری) کو حکومت کا مذہب قرار دیا گیا ہے؟.....۲۸۵

تینتیسواں سوال: کیا شیعہ نماز وتر کو واجب سمجھتے ہیں؟.....۲۸۹
چونتیسواں سوال: کیا اولیائے خدا کی غیبی طاقت پر عقیدہ رکھنا شرک ہے.....۲۹۱
پینتسواں سوال: کیوں منصب امامت، منصب نبوت سے افضل ہے؟.....۲۹۷
چھتیسواں سوال: توحید اور شرک کی شناخت کا معیار کیا ہے؟.....۳۰۹

حرف اول

جب آفتاب عالم تاب افق پر نمودار ہوتا ہے کائنات کی ہر چیز اپنی صلاحیت وظرفیت کے مطابق اس سے فیضیاب ہوتی ہے حتی ننھے ننھے پودے اس کی کرنوں سے سبزی حاصل کرتے اور غنچے وکلیاں رنگ ونکھار پیدا کر لیتی ہیں تاریکیاں کافور اور کوچہ وراہ اجالوں سے پر نور ہو جاتے ہیں، چنانچہ متمدن دنیا سے دور عرب کی سنگلاخ وادیوں میں قدرت کی فیاضیوں سے جس وقت اسلام کا سورج طلوع ہوا، دنیا کی ہر فرد اور ہر قوم نے قوت وقابلیت کے اعتبار سے فیض اٹھایا۔

اسلام کے مبلغ وموسس سرور کائنات حضرت محمد مصطفی ﷺ غار حراء سے مشعل حق لے کر آئے اور علم وآگہی کی پیاسی اس دنیا کو چشمۂ حق وحقیقت سے سیراب کر دیا، آپ کے تمام الٰہی پیغامات ایک ایک عقیدہ اور ایک ایک عمل فطرت انسانی سے ہم آہنگ ارتقائے بشریت کی ضرورت تھا، اس لئے ۲۳ برس کے مختصر عرصے میں ہی اسلام کی عالمتاب شعاعیں ہر طرف پھیل گئیں اور اس وقت دنیا پر حکمراں ایران وروم کی قدیم تہذیبیں اسلامی قدروں کے سامنے ماند پڑ گئیں، وہ تہذیبی اصنام جو صرف دیکھنے میں اچھے لگتے ہیں اگر حرکت وعمل سے عاری ہوں اور انسانیت کو سمت دینے کا حوصلہ، ولولہ اور شعور نہ رکھتے تو مذہبِ عقل وآگہی سے روبرو ہونے کی توانائی کھو دیتے ہیں یہی وجہ ہے کہ کہ ایک چوتھائی صدی سے بھی کم مدت میں اسلام نے

تمام ادیان و مذاہب اور تہذیب و روایات پر غلبہ حاصل کر لیا۔

اگرچہ رسول اسلام ﷺ کی یہ گرانبہا میراث کہ جس کی اہل بیت علیہم السلام اور ان کے پیروؤں نے خود کو طوفانی خطرات سے گزار کر حفاظت و پاسبانی کی ہے، وقت کے ہاتھوں خود فرزندان اسلام کی بے توجہی اور ناقدری کے سبب ایک طویل عرصے کے لئے تنگنائیوں کا شکار ہو کر اپنی عمومی افادیت کو عام کرنے سے محروم کر دئی گئی تھی، پھر بھی حکومت و سیاست کے عتاب کی پرواکئے بغیر مکتب اہل بیت علیہم السلام نے اپنا چشمۂ فیض جاری رکھا اور چودہ سو سال کے عرصے میں بہت سے ایسے جلیل القدر علماء و دانشور دنیائے اسلام کو تقدیم کئے جنھوں نے بیرونی افکار و نظریات سے متاثر اسلام و قرآن مخالف فکری و نظری موجوں کی زد پر اپنی حق آگین تحریروں اور تقریروں سے مکتب اسلام کی پشتپناہی کی ہے اور ہر دور اور ہر زمانے میں ہر قسم کے شکوک و شبہات کا ازالہ کیا ہے، خاص طور پر عصر حاضر میں اسلامی انقلاب کی کامیابی کے بعد ساری دنیا کی نگاہیں ایک بار پھر اسلام و قرآن اور مکتب اہل بیت علیہم السلام کی طرف اٹھی اور گڑی ہوئی ہیں، دشمنان اسلام اس فکری و معنوی قوت و اقتدار کو توڑنے کے لئے اور دوستداران اسلام اس مذہبی اور ثقافتی موج کے ساتھ اپنا رشتہ جوڑنے اور کامیاب و کامراں زندگی حاصل کرنے کے لئے بے چین و بے تاب ہیں، یہ زمانہ علمی اور فکری مقابلے کا زمانہ ہے اور جو مکتب بھی تبلیغ اور نشر و اشاعت کے بہتر طریقوں سے فائدہ اٹھا کر انسانی عقل و شعور کو جذب کرنے والے افکار و نظریات دنیا تک پہنچائے گا، وہ اس میدان میں آگے نکل جائے گا۔

)عالمی اہل بیت ؑ کونسل) مجمع جہانی اہل بیت علیہم السلام نے بھی مسلمانوں خاص طور پر اہل بیت ؑ عصمت و طہارت کے پیروؤں کے درمیان ہم فکری و یکجہتی کو فروغ دینا وقت کی ایک اہم ضرورت قرار دیتے ہوئے اس راہ میں قدم اٹھایا ہے کہ اس نورانی تحریک میں حصہ لے کر بہتر انداز سے اپنا فریضہ ادا کرے، تاکہ موجودہ دنیائے بشریت جو قرآن و عترت کے صاف و شفاف معارف کی پیاسی ہے زیادہ سے زیادہ عشق و معنویت سے سرشار اسلام کے اس مکتب عرفان و ولایت سے سیراب ہو سکے، ہمیں یقین ہے عقل و خرد پر استوار ماہرانہ انداز میں اگر اہل بیت ؑ عصمت و طہارت کی ثقافت کو عام کیا جائے اور حریت و بیداری کے علمبردار خاندان نبوتؐ رسالت کی جاوداں میراث اپنے صحیح خد و خال میں دنیا تک پہنچادی جائے تو اخلاق و انسانیت کے دشمن، انانیت کے شکار، سامراجی خوں خواروں کی نام نہاد تہذیب و ثقافت اور عصر حاضر کی ترقی یافتہ جہالت سے تھکی ماندی آدمیت کو امن و نجات کی دعوتوں کے ذریعہ امام عصر (عج) کی عالمی حکومت کے استقبال کے لئے تیار کیا جا سکتا ہے۔

ہم اس راہ میں تمام علمی و تحقیقی کوششوں کے لئے محققین و مصنفین کے شکر گزار ہیں اور خود کو مؤلفین و مترجمین کا ادنی خدمتگار تصور کرتے ہیں، زیر نظر کتاب، مکتب اہل بیت علیہم السلام کی ترویج و اشاعت کے اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے، فاضل علام آقای سید رضا حسینی نسب کی گرانقدر کتاب (شیعہ پاسخ می دھد) کو مولانا عمران مہدی نے اردو زبان میں اپنے ترجمہ سے آراستہ کیا ہے جس کے لئے ہم دونوں کے شکر گزار ہیں اور مزید توفیقات کے آرزومند ہیں، اسی منزل میں ہم اپنے تمام دوستوں اور معاونین کا بھی صمیم قلب سے شکریہ ادا کرتے ہیں کہ جنھوں نے اس کتاب کے منظر عام تک آنے میں کسی بھی عنوان سے زحمت اٹھائی ہے، خدا کرے کہ ثقافتی میدان میں یہ ادنی جہاد رضائے مولی کا باعث قرار پائے۔

والسلام مع الاکرام

مدیر امور ثقافت، مجمع جہانی اہل بیت علیہم السلام

پیش گفتار

عالم اسلام کے موجودہ حالات سے باخبر حضرات یہ بات بخوبی جانتے ہیں کہ آج امت اسلامیہ کئی ''امتوں'' میں بٹی ہوئی ہے۔اور ہر امت خاص نظریات اور رسومات کی پابند ہے جسکے نتیجہ میں ان کی زندگی کی باگ ڈور ایسے لوگوں کے ہاتھوں میں پہنچ گئی ہے کہ جن کی بقا کا راز ہی مسلمانوں کے درمیان اختلاف پیدا کرنے میں ہے اور وہ اپنے اس منصوبے کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کیلئے مختلف طریقوں سے سرمایہ گزاری کرتے ہیں اور اس کیلئے ہر ممکن وسیلے کو بروئے کار لاتے ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ اسلامی فرقوں کے درمیان چند اختلافی مسائل ضرور پائے جاتے ہیں اگرچہ ان اختلافی مسائل کا تعلق علم کلام کے ایسے مسائل سے ہے جن کے موجد خود اسلامی متکلمین ہیں اور مسلمانوں کی اکثریت ان سے آگاہ تک نہیں ہے۔اور یہ بالکل طے شدہ بات ہے کہ مسلمانوں کے درمیان ان اختلافی مسائل سے کہیں زیادہ اہم، مشترک نکات بھی پائے جاتے ہیں کہ جنھوں نے انہیں ایک دوسرے سے جوڑ رکھا ہے لیکن اختلاف ڈالنے والے افراد، اصول اور فروع میں موجود ان مشترک نکات کو چھوڑ کر صرف اختلافی مسائل کو ہی بیان کرتے ہیں۔

''اتحاد بین المسلمین'' کی ایک کانفرنس میں انفرادی مسائل (جیسے نکاح، طلاق اور میراث وغیرہ ہیں) سے متعلق اسلامی مذاہب کے فقہی نظریات کا بیان میرے سپرد کیا گیا تھا چنانچہ میں نے اس کانفرنس میں ان موضوعات کے متعلق ایک تحقیقی رسالہ پیش کیا کہ جس نے تمام شرکاء کو تعجب میں ڈال دیا اس رسالہ کے مطالعہ سے پہلے کسی کے لئے ہر گز یہ بات قابل قبول نہ تھی کہ فقہ شیعہ ان تینوں موضوعات کے اکثر مسائل میں اہل سنت کے موجودہ چاروں مذاہب سے موافقت رکھتی ہے۔

یہ اختلاف ڈالنے والے افراد، شیعوں کو دوسرے اسلامی فرقوں سے جدا سمجھتے ہیں اور شب و روز اپنے ذرائع ابلاغ کے ذریعہ اس مظلوم فرقے کے خلاف سرگرم عمل ہیں۔یہ لوگ اپنے ان کاموں کے ذریعہ اپنے مشترکہ دشمن کی خدمت کر رہے ہیں ان ناآگاہ افراد کو میری یہ نصیحت ہے کہ وہ شیعوں سے بھائی چارے، اور ان کے علماء اور دانشوروں سے رابطے کے ذریعہ اپنی آنکھوں سے ناآگاہی کے پردے ہٹادیں اور شیعوں کو اپنا دینی بھائی سمجھیں اور اس طرح وہ قرآن مجید کی درج ذیل آیت کے مصداق قرار پائیں:

)إِنَّ هَٰذِهِ أُمَّتُكُمْ أُمَّةً وَاحِدَةً وَأَنَا رَبُّكُمْ فَاعْبُدُونِ(

استعمار کے پرانے حربوں میں سے ایک حربہ مسلمانوں کے درمیان طرح طرح کے شبہات اور اعتراضات پیدا کرنا رہا ہے تاکہ وہ اس طرح ایران کے اسلامی انقلاب کو نقصان پہنچا سکیں اور یہ وہ پرانا حربہ ہے جو آخری چند صدیوں میں مشرق وسطیٰ اور دوسرے علاقوں میں مختلف صورتوں میں رائج رہا ہے

حج کے موقع پر بہت سے حجاج کرام اسلامی انقلاب سے آشنائی حاصل کرتے ہیں مگر دوسری طرف سے دشمنوں کی غلط تبلیغات ان کے اذہان کو تشویش میں مبتلا کر دیتی ہیں اور وہ حجاج جب ایرانی حجاج سے ملتے ہیں تو ان سے ان سوالات کے جوابات کا مطالبہ کرتے ہیں۔ آپ کے ہاتھوں میں موجود یہ کتاب دینی اور ثقافتی مسائل سے متعلق انہی سوالوں کا جواب دینے کی خاطر تحریر کی گئی ہے۔ اس کتاب کو میری نگرانی میں محترم جناب سید رضا حسینی نسب نے ان سوالوں کا جواب دینے کے لئے منظم انداز سے تحریر کیا ہے۔ البتہ اختصار کی خاطر ضرورت کے مطابق مختصر جوابات ہی پیش کئے گئے ہیں مزید تفصیلات کسی اور مقام پر پیش کی جائیں گی۔

امید ہے کہ یہ ناچیز خدمت امام زمانہ (ارواحنالہ الفداء) کی بارگاہ میں مورد قبول قرار پائے گی۔

جعفر سبحانی

حوزۂ علمیہ قم

۲۲ نومبر ۱۹۹۴ء

پہلا سوال

''وعترتی اہل بیتی'' صحیح ہے یا ''وسنتی''؟

حدیث ثقلین ایک بے حد مشہور حدیث ہے جسے محدثین نے اپنی کتابوں میں ان دو طریقوں سے نقل کیا ہے:

الف: ''کتاب اللہ وعترتي أہل بیتي''

ب: ''کتاب اللہ وسنتي''

اب دیکھنا یہ ہے کہ ان دو میں سے کونسی حدیث صحیح ہے؟

جواب: پیغمبر اسلام ﷺ سے جو حدیث صحیح اور معتبر طریقے سے نقل ہوئی ہے اس میں لفظ ''اہل بیتی'' آیا ہے. اور وہ روایت جس میں ''اہل بیتی'' کی جگہ ''سنتی'' آیا ہے وہ سند کے اعتبار سے باطل اور ناقابل قبول ہے ہاں جس حدیث میں ''واہل بیتی'' ہے اس کی سند مکمل طور پر صحیح ہے.

حدیث ''واہل بیتی'' کی سند

اس مضمون کی حدیث کو دو بزرگ محدثوں نے نقل کیا ہے:

۱۔ مسلم، اپنی صحیح میں زید بن ارقم سے نقل کرتے ہیں: ایک دن پیغمبر اکرمؐ نے ایک ایسے تالاب کے کنارے ایک خطبہ ارشاد فرمایا جس کا نام ''خم'' تھا یہ مکہ اور مدینہ کے درمیان واقع تھا اس خطبے میں آپؐ نے خداوند کریم کی حمد وثنا کے بعد لوگوں کو نصیحت فرمائی اور یوں فرمایا:

''أَلَا أَیُّہا الناس، فإنما أنا بشر یوشک أن یأتي رسول ربي فأجیب وأنا تارک فیکم الثقلین. أولھما کتاب اللہ فیہ الھدی والنور، فخذوا کتاب اللہ واستمسکوا بہ، فحث علی کتاب اللہ ورغب فیہ ثم قال: وأھل بیتي أذکرکم اللہ في أھل بیتي. أذکرکم اللہ في أھل بیتي. أذکرکم اللہ في أھل بیتي.''(۱(

اے لوگو! بے شک میں ایک بشر ہوں اور قریب ہے کہ میرے پروردگار کا بھیجا ہوا نمائندہ آئے اور میں اس کی دعوت قبول کروں میں تمہارے درمیان دو وزنی چیزیں چھوڑے جارہا ہوں ایک کتاب خدا ہے جس میں ہدایت اور نور ہے کتاب خدا کو لے لو اور اسے تھامے رکھو اور پھر پیغمبر اسلامؐ نے کتاب خدا پر عمل کرنے کی تاکید فرمائی اور اس کی جانب رغبت دلائی اس کے بعد یوں

)۱(صحیح مسلم جلد ۴ ص ۱۸۰۳ حدیث نمبر ۲۴۰۸ طبع عبدالباقی

فرمایا اور دوسرے میرے اہل بیتؑ ہیں. اپنے اہل بیت کے سلسلے میں، میں تمہیں خدا کی یاد دلاتا ہوں اور اس جملے کی تین مرتبہ تکرار فرمائی.

اس حدیث کے متن کو دارمی نے بھی اپنی کتاب سنن(۱) میں نقل کیا ہے. پس کہنا چاہئے کہ حدیث ثقلین کے مذکورہ فقرے کیلئے یہ دونوں ہی سندیں روز روشن کی طرح واضح ہیں اور ان میں کوئی خدشہ نہیں ہے.

۲۔ ترمذی نے اس حدیث کے متن کو لفظ ''عترتی اھل بیتی'' کے ساتھ نقل کیا ہے: متنِ حدیث اس طرح ہے:

''إنّي تارک فیکم ما إن تمسکتم بہ لن تضلوا

بعدي، أحدھما أعظم من الآخر: کتاب اللہ

حبل ممدود من السماء الى الأرض وعترتي
أهل بيتي، لن يفترقا حتى يردا عليَّ الحوض
فانظروا كيف تخلفوني فيهما"(١(

میں تمہارے درمیان دو چیزیں چھوڑے جارہا ہوں جب تک تم ان سے متمسک رہو گے ہر گز گمراہ نہ ہو گے، ان دو چیزوں میں سے ایک دوسری سے بڑی ہے، کتاب خدا ایک ایسی رسی ہے جو آسمان

)١(سنن دارمی جلد ٢ ص ٤٣١، ٤٣٢

)٢(سنن ترمذی جلد ٥ ص ٦٦٣ نمبر ٣٧٧٨٨

سے زمین تک آویزاں ہے اور دوسرے میرے اہل بیت ہیں. اور یہ دونوں ہر گز ایک دوسرے سے جدا نہ ہوں گے یہاں تک کہ حوض کوثر پر مجھ سے آملیں. لہذا یہ دیکھنا کہ تم میرے بعد ان کے ساتھ کس طرح کا برتاؤ کرتے ہو.
صحیح کے مؤلف مسلم اور سنن کے مؤلف ترمذی نے لفظ "اہل بیتی" پر زور دیا ہے اور یہی مطلب ہمارے نظریہ کو ثابت کرنے کے لئے کافی ہے یہی نہیں بلکہ ان کی نقل کردہ

سندیں پوری طرح سے قابل اعتماد اور خصوصی طور پر معتبر مانی گئی ہیں.

لفظ "وسنتی" والی حدیث کی سند

وہ روایت کہ جس میں لفظ "اہل بیتی" کی جگہ "سنتی" آیا ہے جعلی ہے. اس کی سند ضعیف ہے اور اسے اموی حکومت کے درباریوں نے گھڑا ہے.
١۔ حاکم نیشاپوری نے اپنی کتاب مستدرک میں مذکورہ مضمون کو ذیل کی سندوں کے ساتھ نقل کیا ہے.
"عباس بن أبي أويس" عن "أبي أويس" عن "ثور بن زيد الديلمي" عن "عكرمہ" عن "ابن عباس" قال رسول اللہ: "يا أيّها الناس إنّي قد تركت فيكم، إن اعتصمتم بہ فلن تضلوا أبداً كتاب اللہ وسنتہ نبيہ".
اے لوگو! میں نے تمہارے درمیان دو چیزوں کو چھوڑا ہے اگر تم نے ان دونوں کو تھامے رکھا تو ہر گز گمراہ نہ ہو گے. اور وہ کتاب خدا اور سنت پیغمبرؐ ہیں.(١(

اس حدیث کے اس مضمون کے راویوں کے درمیان ایک ایسے باپ بیٹے ہیں جو سند کی دنیا میں آفت شمار ہوتے ہیں وہ باپ بیٹے اسماعیل بن ابی اویس اور ابو اویس ہیں کسی نے بھی ان کے موثق ہونے کی شہادت نہیں دی ہے بلکہ ان کے بارے میں یہ مشہور ہے کہ یہ دونوں جھوٹے اور حدیثیں گھڑنے والے تھے.

ان دو کے بارے میں علمائے رجال کا نظریہ

حافظ مزی نے اپنی کتاب تہذیب الکمال میں اسماعیل اور اس کے باپ کے بارے میں علم رجال کے محققین کا نظریہ اس طرح نقل کیا ہے: یحییٰ بن معین (جن کا شمار علم رجال کے بزرگ علماء میں ہوتا ہے) کہتے ہیں کہ ابواویس اور ان کا بیٹا دونوں ہی ضعیف ہیں.

اسی طرح یحییٰ بن معین سے یہ بھی منقول ہے کہ وہ کہتے تھے کہ یہ دونوں حدیث کے چور تھے۔ابن معین سے بھی اسی طرح منقول ہے کہ وہ کہتے تھے کہ ابواویس کے بیٹے پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا.

ابواویس کے بیٹے کے بارے میں نسائی کہتے تھے کہ وہ ضعیف اور نا قابل اعتماد ہے.

)۱(حاکم مستدرک جلد نمبر ا ص ۹۳

ابوالقاسم لالکائی نے لکھا ہے کہ ''نسائی'' نے اس کے خلاف بہت سی باتیں کہی ہیں اور یہاں تک کہا ہے کہ اس کی حدیثوں کو چھوڑ دیا جائے.

ابن عدی (جو کہ علماء رجال میں سے ہیں) کہتے ہیں کہ ابن ابی اویس نے اپنے ماموں مالک سے ایسی عجیب و غریب روایتیں نقل کی ہیں جن کو ماننے کے لئے کوئی بھی تیار نہیں ہے (۱(

ابن حجر اپنی کتاب فتح الباری کے مقدمہ میں لکھتے ہیں، ابن ابی اویس کی حدیث سے ہر گز حجت قائم نہیں کی جاسکتی، چونکہ نسائی نے اس کی مذمت کی ہے. (۲(

حافظ سید احمد بن صدیق اپنی کتاب فتح الملک العلی میں سلمہ بن شیب سے اسماعیل بن ابی اویس کے بارے میں نقل کرتے ہیں، سلمہ بن شیب کہتے ہیں کہ میں نے خود اسماعیل بن ابی اویس سے سنا ہے کہ وہ کہہ رہا تھا: جب میں یہ دیکھتا کہ مدینہ والے کسی مسئلے میں اختلاف کر کے دو گروہوں میں بٹ گئے ہیں تو اس وقت میں حدیث گھڑ لیتا تھا. (۳(

اس اعتبار سے اسماعیل بن ابی اویس کا جرم یہ ہے کہ وہ حدیثیں گھڑتا تھا ابن معین نے کہا ہے کہ وہ جھوٹا تھا اس سے بڑھ کر یہ کہ اس کی حدیث کو نہ تو صحیح مسلم نے نقل کیا ہے

)۱ (حافظ مزی، کتاب تہذیب الکمال ج ۳ ص ۱۲۷

)۲ (مقدمہ فتح الباری ابن حجر عسقلانی ص ۳۹۱ طبع دار المعرفۃ

)۳ (کتاب فتح الملک العلی، حافظ سید احمد ص ۱۵

اور نہ ہی ترمذی نے، اور نہ ہی دوسری کتب صحاح میں اس کی حدیث کو نقل کیا گیا ہے .

اور اسی طرح ابواویس کے بارے میں اتنا ہی کافی ہے کہ ابو حاتم رازی نے اپنی کتاب ''جرح و تعدیل'' میں اس کے بارے میں یہ لکھا ہے کہ ابواویس کی حدیثیں کتابوں میں لکھی تو جاتی ہیں مگر ان سے حجت قائم نہیں کی جاسکتی کیونکہ اس کی حدیثیں قوی اور محکم نہیں ہیں (۱(

اسی طرح ابو حاتم نے ابن معین سے نقل کیا ہے کہ ابواویس قابل اعتماد نہیں ہے.

جب وہ روایت صحیح نہیں ہو سکتی جس کی سند میں یہ دو افراد ہوں تو پھر اس روایت کا کیا حال ہو گا جو ایک صحیح اور قابل عمل روایت کی مخالف ہو.

یہاں پر قابل توجہ نکتہ یہ ہے کہ اس حدیث کے ناقل حاکم نیشاپوری نے خود اس

حدیث کے ضعیف ہونے کا اعتراف کیا ہے اسی وجہ سے انہوں نے اس حدیث کی سند کی تصحیح نہیں کی ہے لیکن اس حدیث کے صحیح ہونے کے لئے ایک گواہ لائے ہیں جو خود سند کے اعتبار سے کمزور اور ناقابل اعتبار ہے اسی وجہ سے یہ شاہد حدیث کو تقویت دینے کے بجائے اس کو اور ضعیف بنا رہا ہے اب ہم یہاں ان کے لائے ہوئے فضول گواہ کو درج ذیل عنوان کی صورت میں ذکر کرتے ہیں:

)۱(الجرح والتعدیل جلد ۵ ص ۱۹۲ ابو حاتم رازی

حدیث ''وسنتی'' کی دوسری سند

حاکم نیشاپوری نے اس حدیث کو ابو ہریرہ سے مرفوع(۱) طریقہ سے ایک ایسی سند کے ساتھ جسے ہم بعد میں پیش کریں گے یوں نقل کیا ہے:

إني قد تركت فيكم شيئين لن تضلوا بعدهما: كتاب الله وسنتي ولن يفترقا حتى يردا عليَّ الحوض. (۲(

اس متن کو حاکم نیشاپوری نے درج ذیل سلسلہ سند کے ساتھ نقل کیا ہے:

''الضبي'' عن ''صالح بن موسیٰ الطلحي'' عن ''عبد العزیز بن رفیع'' عن ''أبي صالح'' عن ''أبي ہریرہ''

یہ حدیث بھی پہلی حدیث کی طرح جعلی ہے. اس حدیث کے سلسلہ سند میں صالح بن موسی الطلحی نامی شخص ہے جس کے بارے میں ہم علم رجال کے بزرگ علماء کے

نظریات کو یہاں بیان کرتے ہیں:

یحییٰ بن معین کہتے ہیں: کہ صالح بن موسیٰ قابل اعتماد نہیں ہے. ابو حاتم رازی کہتے ہیں، اس کی حدیث ضعیف اور ناقابل قبول ہے اس نے بہت سے موثق و معتبر

)۱(حدیث مرفوع: ایسی حدیث کو کہا جاتا ہے جس کی سند سے ایک یا کئی افراد حذف ہوں اور ان کی جگہ کلمہ ''رفعہ'' استعمال کر دیا گیا ہو تو ایسی حدیث ضعیف ہو گی.(مترجم(

)۲ (حاکم مستدرک جلد ۱ ص ۹۳

افراد کی طرف نسبت دے کر بہت سی ناقابل قبول احادیث کو نقل کیا ہے.

نسائی کہتے ہیں کہ صالح بن موسیٰ کی نقل کردہ احادیث لکھنے کے قابل نہیں ہیں، ایک اور مقام پر کہتے ہیں کہ اس کی نقل کردہ احادیث متروک ہیں.(۱(

ابن حجر اپنی کتاب '' تھذیب التھذیب'' میں لکھتے ہیں: ابن حِبانؒ کہتے ہیں: کہ صالح بن موسیٰ موثق افراد کی طرف ایسی باتوں کی نسبت دیتا ہے جو ذرا بھی ان کی باتوں سے مشابہت نہیں رکھتیں سرانجام اس کے بارے میں یوں کہتے ہیں: اس کی حدیث نہ تو دلیل بن سکتی ہے اور نہ ہی اس کی حدیث حجت ہے ابو نعیم اس کے بارے میں یوں کہتے ہیں: اس کی حدیث متروک ہے۔ وہ ہمیشہ ناقابل قبول حدیثیں نقل کرتا تھا(۲(

اسی طرح ابن حجر اپنی کتاب تقریب(۳) میں کہتے ہیں کہ اس کی حدیث متروک ہے اسی طرح ذہبی نے اپنی کتاب کاشف(۴) میں اس کے بارے میں لکھا ہے کہ صالح بن موسیٰ کی حدیث ضعیف ہے.

یہاں تک کہ ذہبی نے صالح بن موسیٰ کی اسی حدیث کو اپنی کتاب ''میزان الاعتدال ''

میں ذکر کرتے ہوئے کہا ہے کہ صالح بن موسیٰ کی نقل کردہ یہ حدیث اس کی ناقابل قبول احادیث میں سے ہے.(۵ (

)۱(تہذیب الکمال جلد ۱۳ص ۹۶ حافظ مزی.

)۲(تہذیب التہذیب جلد ۴ص ۳۵۵،ابن حجر

)۳(ترجمہ تقریب، نمبر ۲۸۹۱،ابن حجر

)۴(ترجمہ الکاشف، نمبر ۲۴۱۲ ذہبی

)۵(میزان الاعتدال جلد ۲ص ۳۰۲ ذہبی

حدیث ''وسنتی'' کی تیسری سند

ابن عبدالبر نے اپنی کتاب ''تمہید''(۱) میں اس حدیث کے متن کو درج ذیل سلسلہ سند کے ساتھ نقل کیا ہے.

''عبدالرحمن بن یحییٰ'' عن ''احمد بن سعید'' عن ''محمد بن ابراھیم الدبیلی'' عن ''علي بن زید الفرائضي'' عن ''الحنیني'' عن ''کثیر بن عبداللہ بن عمرو بن عوف'' عن ''أبیہ'' عن ''جدہ. ''

امام شافعی نے کثیر بن عبداللہ کے بارے میں کہا ہے کہ وہ جھوٹ کے ارکان میں سے ایک رکن تھا۔(۲(

ابو داؤد کہتے ہیں کہ وہ بہت زیادہ جھوٹ بولنے والے افراد میں سے تھا.(۳(

ابن حبان اس کے بارے میں کہتے ہیں کہ عبداللہ بن کثیر نے حدیث کی جو کتاب اپنے باپ اور دادا سے نقل کی ہے اس کی بنیاد جعل حدیث پر ہے اس کی کتاب سے کچھ نقل کرنا اور عبداللہ بن کثیر سے روایت لینا قطعا حرام ہے صرف اس صورت میں صحیح ہے کہ اس کی بات کو تعجب کے طور پر یا تنقید کرنے کے لئے نقل کیا جائے. (۴ (

)۱ (التمہید، جلد ۲۴ص ۳۳۱

)۲ (تھذیب التھذیب جلد۸ص۳۷۷ (دارالفکر) اور تھذیب الکمال جلد۲۴ص۱۳۸

)۳ (گزشتہ کتابوں سے مأخوذ

)۴ (المجروحین، جلد۲ص۱۲۱ابن حبان

نسائی اور دار قطنی کہتے ہیں: اس کی حدیث متروک ہے امام احمد کہتے ہیں : کہ وہ معتبر راوی نہیں ہے اور اعتماد کے لائق نہیں ہے.

اسی طرح اس کے بارے میں ابن معین کا بھی یہی نظریہ ہے تعجب انگیز بات تو یہ ہے کہ ابن حجر نے ''التقریب'' کے ترجمہ میں صالح بن موسیٰ کو فقط ضعیف کہنے پر اکتفاء کیا ہے اور صالح بن موسیٰ کو جھوٹا کہنے والوں کو شدت پسند قرار دیا ہے، حالانکہ علمائے رجال نے اس کے بارے میں جھوٹا اور حدیثیں گھڑنے والا جیسے الفاظ استعمال کئے ہیں یہاں تک کہ ذھبی اس کے بارے میں کہتے ہیں: اس کی باتیں باطل اور ضعیف ہیں.

سند کے بغیر متن کا نقل

امام مالک نے اسی متن کو کتاب ''الموطا''(۱) میں سند کے بغیر اور بصورت مرسل(۲) نقل کیا ہے جبکہ ہم سب جانتے ہیں کہ اس قسم کی حدیث کوئی حیثیت نہیں رکھتی اس تحقیق سے قطعی طور پر یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ حدیث جس میں ''وسنتی'' ہے وہ جعلی اور من گھڑت ہے اور اسے جھوٹے راویوں اور اموی حکومت کے درباریوں نے ''وعترتی'' کے کلمہ والی صحیح حدیث کے مقابلے میں گھڑا ہے لہذا مساجد کے خطباء،

)۱ (الموطا، مالک ص۸۸۹ حدیث ۳

)۲(روایت مرسل: ایسی روایت کو کہا جاتا ہے جس کے سلسلہ سند سے کوئی راوی حذف ہو جیسے کہا جائے ''عن رجل'' یا عن بعض اصحابنا تو ایسی روایت مرسلہ ہو گی (مترجم(

مقررین اور ائمہ جماعت حضرات کے لئے ضروری ہے کہ وہ اس حدیث کو چھوڑ دیں جو رسول ﷺ نے بیان نہیں کی ہے بلکہ اس کی جگہ صحیح حدیث سے لوگوں کو آشنا کریں. اور وہ حدیث جسے مسلم نے اپنی کتاب ''صحیح'' میں لفظ ''واہل بیتی'' کے ساتھ اور ترمذی نے لفظ ''عترتی واہل بیتی'' کے ساتھ نقل کیا ہے اسے لوگوں کے سامنے بیان کریں اسی طرح علم و دانش کے متلاشی افراد کے لئے ضروری ہے کہ علم حدیث سیکھیں تاکہ صحیح اور ضعیف حدیث کو ایک دوسرے سے جدا کر سکیں.

آخر میں ہم یہ یاد دلادیں کہ حدیث ثقلین میں لفظ ''اہل بیتی'' سے پیغمبر اسلامؐ کی مراد حضرت علی۔ اور وہ حضرت فاطمہ زہرا۲۳۶۱، حضرت امام حسن۔ اور حضرت امام حسین۔ ہیں۔

کیونکہ مسلم نے(۱) اپنی کتاب صحیح میں اور ترمذی نے(۲) اپنی کتاب سنن میں حضرت عائشہ سے اس طرح نقل کیا ہے:

نزلت ھذہ الآیۃ علی النبی ﷺ .(اِنّمایریدُ اللہُ لیذھبَ عنکُم الرِجسَ اَھلَ البیتِ ویُطَھرکم تطھیراً) فی بیت اُم سلمۃ فدعا النبی ﷺ فاطمۃ وحسناً وحسیناً فجللھم بکساءٍ وعَلیّ خلف

)۱(صحیح مسلم جلد ۴ ص ۱۸۸۳ ح ۲۴۲۴

)۲(ترمذی جلد ۵ ص ۶۶۳

ظهره فجللّه بكساء ثم قال: اَللّٰهم هؤلاءِ اَهل بيتي فاَذهبعنهم الرجس وطهرهم تطهيرا. قالت اُم سلمة وأنا معهم يا نبي الله؟ قال أنتِ علىٰ مكانك وأنتِ إلى الخير.(۱(

یہ آیت (اِنّما یرید اللہُ لیذھبَ عنکم الرِجسَ اَھلَ البیتِ ویُطَھّرکم تطھیراً)ام سلمہ کے گھر میں نازل ہوئی ہے پیغمبر اسلامؐ نے فاطمہؑ، حسنؑ و حسینؑ کو اپنی عبا کے اندر لے لیا اس وقت علیؑ آنحضرتؐ کے پیچھے تھے آپ نے ان کو بھی چادر کے اندر بلالیا اور فرمایا: اے میرے پروردگار یہ میرے اہل بیت ہیں پلیدیوں کو ان سے دور رکھ اور ان کو پاک و پاکیزہ قرار دے۔ام سلمہ نے کہا: اے پیغمبر خداؐ کیا میں بھی ان میں سے ہوں (یعنی آیت میں جو لفظ اہل بیت آیا ہے میں بھی اس میں شامل ہوں؟) پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا تم اپنی جگہ پر ہی رہو (عبا کے نیچے مت آؤ) اور تم نیکی کے راستے پر ہو۔''

حدیث ثقلین کا مفہوم

چونکہ رسول اسلام نے عترت کو قرآن کا ہم پلہ قرار دیا ہے اور دونوں کو امت کے

)۱(اقتباس از حسن بن علی السقاف صحیح صفۃ صلاۃ النبی ﷺ ص ۲۹۴. ۲۸۹

درمیان حجت خدا قرار دیا ہے لہٰذا اس سے دو نتیجے نکلتے ہیں:

۱۔ قرآن کی طرح عترت رسولؐ کا کلام بھی حجت ہے اور تمام دینی امور خواہ وہ عقیدے سے متعلق ہوں یا فقہ سے متعلق ان سب میں ضروری ہے کہ ان کے کلام سے

تمسک کیا جائے، اور ان کی طرف سے دلیل و رہنمائی مل جانے کے بعد ان سے روگردانی کر کے کسی اور کی طرف نہیں جانا چاہئے.

پیغمبر خداؐ کی وفات کے بعد مسلمان خلافت اور امت کے سیاسی امور کی رہبری کے مسئلہ میں دو گروہوں میں بٹ گئے اور ہر گروہ اپنی بات کو حق ثابت کرنے کے لئے دلیل پیش کرنے لگا اگرچہ مسلمانوں کے درمیان اس مسئلہ میں اختلاف ہے مگر اہل بیت کی علمی مرجعیت کے سلسلے میں کوئی اختلاف نہیں کیا جاسکتا.

کیونکہ سارے مسلمان حدیث ثقلین کے صحیح ہونے پر متفق ہیں اور یہ حدیث عقائد اور احکام میں قرآن اور عترت کو مرجع قرار دیتی ہے اگر امت اسلامی اس حدیث پر عمل کرتی تو اس کے درمیان اختلاف کا دائرہ محدود اور وحدت کا دائرہ وسیع ہو جاتا.

۲۔ قرآن مجید، کلام خدا ہونے کے لحاظ سے ہر قسم کی خطا اور غلطی سے محفوظ ہے یہ کیسے ممکن ہے کہ اس میں خطا اور غلطی کا احتمال دیا جائے جبکہ خداوند کریم نے اس کی یوں توصیف کی ہے:

)لا یاتیہِ الباطِلُ مِن بَینِ یَدَیہِ وَلا مِن خَلفِہِ تَنزِیلٌ مِن حَکِیمٍ حَمِیدٍ) (۱(

''باطل نہ اس کے آگے سے آتا ہے اور نہ اس کے پیچھے سے اور یہ حکیم و حمید خدا کی طرف سے نازل ہوا ہے''.

اگر قرآن مجید ہر قسم کی خطا سے محفوظ ہے تو اس کے ہم رتبہ اور ہم پلہ افراد بھی ہر قسم

کی خطا سے محفوظ ہیں کیونکہ یہ صحیح نہیں ہے کہ ایک یا کئی خطاکار افراد قرآن مجید کے ہم پلہ اور ہم وزن قرار پائیں۔ یہ حدیث گواہ ہے کہ وہ افراد ہر قسم کی لغزش اور خطا سے محفوظ اور معصوم ہیں البتہ یہ بات ملحوظ رہے کہ عصمت کا لازمہ نبوت نہیں ہے کیونکہ ممکن ہے کہ کوئی معصوم ہو لیکن نبی نہ ہو جیسے حضرت مریم اس آیۂ شریفہ:

)إِنَّ اللہَ اصْطَفَاکِ وَطَہَّرَکِ وَاصْطَفَاکِ عَلَی نِسَاءِ الْعَالَمِینَ)(۲(

)اے مریم!) خدا نے تمہیں چن لیا اور پاکیزہ بنا دیا ہے اور عالمین کی عورتوں میں منتخب قرار دیا ہے۔

کے مطابق گناہ سے تو پاک ہیں لیکن پیغمبر نہیں ہیں۔

)۱(سورہ فصلت آیت ۴۲

)۲ (سورہ آل عمران آیت ۴۲

دوسرا سوال

شیعہ سے کیا مراد ہے؟

جواب: عربی لغت میں ''شیعہ'' کے معنی ہیں پیروی کرنے والا جیسا کہ قرآن مجید فرماتا ہے:

)وَإِنَّ مِنْ شِيعَتِهِ لَإِبْرَاهِيمَ) (۱(

اور یقیناان (نوح) کے پیروکاروں میں سے ابراہیم بھی ہیں۔

لیکن مسلمانوں کی اصطلاح میں شیعہ ان لوگوں کو کہا جاتا ہے جو یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ پیغمبرؐ نے اپنی وفات سے قبل کئی موقعوں پر اپنے جانشین اور خلیفہ کا اعلان فرمایا تھا ان ہی موقعوں میں سے ایک ہجرت کے دسویں سال کی اٹھارہ ذی الحجہ کی تاریخ بھی ہے.

جو روز غدیر خم کے نام سے معروف ہے اس دن آنحضرتؐ نے مسلمانوں کے ایک عظیم مجمع میں اپنے جانشین اور خلیفہ کو اپنے بعد مسلمانوں کے لئے ان کے سیاسی، علمی اور دینی امور میں مرجع قرار دیا تھا اس جواب کی مزید وضاحت یہ ہے: پیغمبر اکرمؐ

)۱ (سورہ صافات آیت ۸۳

کے بعد مہاجرین اور انصار دو گروہوں میں بٹ گئے:

ا۔ایک گروہ کا یہ عقیدہ تھا کہ پیغمبر خداﷺ نے مسئلہ خلافت کو یونہی نہیں چھوڑ دیا تھا بلکہ آپؐ نے اپنے جانشین کو خود معین فرمایا تھا آپؐ کے جانشین حضرت علی بن ابی طالب۔ ہیں جو سب سے پہلے پیغمبر خداؐ پر ایمان لائے تھے.

مہاجرین اور انصار کے اس گروہ میں بنی ہاشم کے تمام سربرآوردہ افراد اور بعض بزرگ مرتبہ صحابہ جیسے سلمان، ابوذر، مقداد اور خباب بن ارت وغیرہ

سر فہرست تھے مسلمانوں کا یہ گروہ اپنے اسی عقیدے پر باقی رہا، اور یہی افراد علی۔ کے شیعہ کہلائے.

البتہ یہ لقب پیغمبر خداؐ نے اپنی زندگی ہی میں امیر المومنین۔ کے پیروکاروں کو عطا فرمایا تھا آنحضرت نے حضرت علی بن ابی طالب۔ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:

والذي نفسي بيده إنّ هذا وشيعته لهم الفائزون يوم القيامة. (١ (

قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے یہ (علیؑ) اور ان کے پیروکار قیامت کے دن کامیاب ہوں گے.

اس بناپر شیعہ صدر اسلام کے مسلمانوں کے اس گروہ کو کہا جاتا ہے جو یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ منصب ولایت وامامت خدا کی طرف سے معین کیا جاتا ہے اس وجہ سے یہ گروہ اس نام سے مشہور ہوا اور یہ گروہ آج بھی راہ امامت پر گامزن ہے اور اہل بیت پیغمبرؐ کی پیروی

١ (تفسیر در المنثور جلد ٦ جلال الدین سیوطی نے سورۂ بینہ کی ساتویں آیت (إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ أُولَٰئِكَ هُمْ خَيْرُ الْبَرِيَّةِ) کی تفسیر میں یہ حدیث نقل کی ہے.

کرتا ہے اس وضاحت سے شیعوں کا مرتبہ اور مقام بھی واضح ہو جاتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ بعض جاہل یا مفاد پرست افراد کا یہ کلام بھی باطل ہو جاتا ہے کہ شیعیت پیغمبر اکرمؐ کے بعد کی پیداوار ہے تاریخ شیعیت کی مزید اور بہتر شناخت کے لئے ''اصل الشیعہ واصولھا'' ''المراجعات'' اور ''اعیان الشیعہ'' جیسی کتابوں کا مطالعہ مفید ثابت ہو گا.

٢۔ دوسرے گروہ کا عقیدہ یہ تھا کہ منصب خلافت، انتخابی ہے اور اسی لئے انہوں نے حضرت ابو بکر کی بیعت کی اور مدتوں بعد یہی گروہ ''اہل سنت'' یا تسنن کے نام سے مشہور ہوا اور نتیجہ میں ان دو اسلامی گروہوں کے درمیان بہت سے اصولوں میں مشترک نظریات ہونے کے باوجود مسئلہ خلافت اور جانشینی پیغمبر اکرمؐ کے سلسلے میں اختلاف ہو گیا۔ واضح رہے کہ ان فرقوں کے بانی افراد مہاجرین اور انصار تھے.

تیسرا سوال

کیوں حضرت علیؑ ہی پیغمبرؐ کے وصی اور جانشین ہیں؟

جواب: ہم پہلے بھی ذکر کر چکے ہیں کہ شیعوں کا راسخ عقیدہ یہ ہے کہ منصب خلافت، خدا عطا فرماتا ہے اسی طرح ان کا یہ بھی عقیدہ ہے کہ پیغمبر اکرمؐ کے بعد شروع ہونے والی امامت چند اعتبار سے نبوت کی طرح ہے جس طرح یہ ضروری ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خدا معین فرمائے اسی طرح یہ بھی ضروری ہے کہ پیغمبرؐ کے وصی کو بھی خدا ہی معین کرے اس حقیقت کے سلسلے میں حیات پیغمبر اکرمؐ کی تاریخ بہترین گواہ ہے کیونکہ پیغمبر اکرمؐ نے چند موقعوں پر اپنا خلیفہ معین فرمایا ہے ہم یہاں ان میں سے تین موقعوں کا ذکر کرتے ہیں:

ا۔ آغاز بعثت میں:

جب پیغمبر اسلامؐ کو خدا کی طرف سے حکم ہوا کہ اپنے قریبی رشتہ داروں کو اس آیہ کریمہ (وَأَنذِرْ عَشِيرَتَكَ الْأَقْرَبِينَ)(۱) کے مطابق آئین توحید کی طرف

)۱ (سورہ شعراء آیت ۲۱۴

دعوت دیں، تو آنحضرتؐ نے ان سب کو خطاب کرتے ہوئے یوں فرمایا "جو بھی اس راستے میں میری مدد کرے گا، وہی میرا وصی، وزیر، اور جانشین ہوگا" پیغمبر اکرمؐ کے الفاظ یہ تھے :

''فأيكم يؤازرني في هذا الأمر على أن يكون أخي ووزيري وخليفتي ووصيي فيكم''

تم میں سے کون ہے جو اس کام میں میری مدد کرے تاکہ وہی تمہارے درمیان میرا بھائی، وزیر، وصی اور جانشین قرار پائے؟

اس ملکوتی آواز پر صرف اور صرف علی ابن ابی طالب۔ نے لبیک کہا اس وقت پیغمبر اکرمؐ نے اپنے رشتہ داروں کی طرف رخ کرتے ہوئے ارشاد فرمایا :

''إن هذا أخي ووصيي وخليفتي فيكم فاسمعوا له وأطيعوه''(۱(

بہ تحقیق یہ (علیؑ) تمہارے درمیان میرا بھائی، وصی اور جانشین ہے. اس کی باتوں کو سنو اور اس کی پیروی کرو.

۲۔ غزوۂ تبوک میں

پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علی۔ سے فرمایا:

)۱ (تاریخ طبری؛ جلد ۲ ص ۶۳. ۶۲ اور تاریخ کامل جلد ۲ ص ۱۴۱۔ ۱۴۰ اور مسند احمد جلد ۱ ص ۱۱۱،

اور شرح نہج البلاغہ (ابن ابی الحدید) جلد ۱۳ ص ۲۱۲. ۲۱۰

''أما ترضى أن تكون مني بمنزلة هارون من موسىٰ إلا أنّه لا نبي بعدي''(۱ (

کیا تم اس بات سے خوش نہیں ہو کہ تمہاری نسبت مجھ سے ویسی ہی ہے جیسی ہارون کو موسیٰ سے تھی بجز اس کے کہ میرے بعد کوئی پیغمبر نہیں آئے گا.

یعنی جس طرح ہارون۔ حضرت موسیٰ۔ کے بلا فصل وصی اور جانشین تھے، اسی طرح تم بھی میرے خلیفہ اور جانشین ہو۔

۳۔ دسویں ہجری میں

رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حجۃ الوداع سے واپس لوٹتے وقت غدیر خم کے میدان میں مسلمانوں کی بہت بڑی تعداد کے درمیان حضرت علی۔ کو مسلمانوں اور مومنوں کا ولی معین کیا اور فرمایا :

''مَن كنت مولاه فهذا عليٌّ مولاه''

''جس کا میں سرپرست اور صاحب اختیار تھا اب یہ علیؑ اس کے مولا اور سرپرست ہیں ''.

یہاں پر جو اہم اور قابل توجہ نکتہ ہے وہ یہ کہ پیغمبر اسلامؐ نے اپنے خطبے کے آغاز

)۲(سیرۂ ابن ہشام جلد ۲ ص ۵۲۰ اور الصواعق المحرقہ طبع دوم مصر باب ۹ فصل ۲ ص ۱۲۱.

میں ارشاد فرمایا:

''ألستُ أولىٰ بكم مِن أنفسكم؟''

''کیا میں تمہارے نفسوں پر تم سے بڑھ کر حق نہیں رکھتا؟ ''

اس وقت تمام مسلمانوں نے یک زبان ہو کر پیغمبر اکرمؐ کی تصدیق کی تھی لہذا یہاں پر یہ کہنا ضروری ہے کہ آنحضرتؐ کی اس حدیث کی رو سے جو برتری اور اختیار تام رسولؐ کو حاصل تھا وہی برتری واختیار کامل علیؑ کو حاصل ہے۔

اس اعتبار سے یہاں پر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ جس طرح آنحضرتؐ مومنین پر برتری اور فوقیت رکھتے تھے اسی طرح حضرت علی۔ بھی مومنین کے نفسوں پر برتری اور فوقیت رکھتے ہیں اس دن حسان بن ثابت نامی شاعر نے غدیر خم کے اس تاریخی واقعے کو اپنے اشعار میں اس طرح نظم کیا ہے:

ینادیھم یوم الغدیر نبیُّھم بخم واسمع بالرسول منادیا

فقال فمن مولاکم و نبیُّکم؟ فقالوا ولم یبدوا ھناک التعامیا

الھک مولانا و أنت نبیُّنا ولم تلق منا فی الولایۃ عاصیا

فقال لہ قم یا علي فإنني رضیتک من بعدي إماما وھادیا

فمن کنت مولاہ فھذا ولیہ فکونوا لہ أتباع صدق موالیا

ھناک دعا: اللّٰھم وال ولیہ و کن للذي عادیٰ علیاً معادیا(۱(

)۱ (المناقب (خوارزمی مالکی) ص ۸۰ اور تذکرۃ خواص الامہ (سبط ابن جوزی حنفی) ص ۲۰ اور کفایۃ الطالب ص ۱۷ (مصنف گنجی شافعی) وغیرہ...

حدیث غدیر، اسلام کی ایسی متواتر (۱) احادیث میں سے ایک ہے جس کو شیعہ علماء کے علاوہ تقریبا تین سو ساٹھ سنی علماء نے بھی نقل کیا ہے (۲) یہاں تک کہ اس حدیث کا سلسلہ سند ایک سو دس اصحاب پیغمبرؐ تک پہنچتا ہے اور عالم اسلام کے چھبیس بزرگ علماء نے اس حدیث کے سلسلۂ سند کے بارے میں مستقل طور پر کتابیں لکھی ہیں.

مشہور مسلمان مورخ ابو جعفر طبری نے اس حدیث شریف کے سلسلۂ اسناد کو دو بڑی جلدوں میں جمع کیا ہے اس سلسلے میں مزید معلومات کے لئے کتاب ''الغدیر'' کا مطالعہ کریں.

)۱ (حدیث متواتر: وہ روایت ہے جو ایسے متعدد اور مختلف راویوں سے نقل ہوئی ہو جس میں ذرا بھی جھوٹ کا شائبہ نہ رہ جائے. (مترجم(

)۲ (بطور نمونہ کتاب ''الصواعق المحرقہ'' (ابن حجر) طبع دوم مصر باب۹اور فصل ۲ ص ۱۲۲کا مطالعہ کریں.

چوتھا سوال

''ائمہ'' کون ہیں؟

جواب: پیغمبر گرامی اسلامؐ نے اپنی زندگی ہی میں یہ بات واضح کردی تھی کہ آپؐ کے بعد بارہ خلیفے ہوں گے اور سب قریش میں سے ہوں گے اور اسلام کی عزت انہیں خلفاء کی مرہون منت ہوگی.

جابر بن سمرہ کہتے ہیں:

''سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یقول: لا یزال الاسلام عزیزاً الی اثنی عشر خلیفۃً ثم قال کلمۃ لا أسمعھا فقلت لأبي: ما قال؟ فقال: کلھم من قریش.''(۱(

میں نے پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ اسلام کو بارہ خلفاء کے ذریعہ عزت حاصل ہوگی اور پھر پیغمبر اکرمؐ نے کوئی لفظ کہا جسے میں نے نہیں سنا

میں نے اپنے والد سے پوچھا کہ پیغمبر اکرمؐ نے کیا

)۱(صحیح مسلم جلد ۶ صفحہ ۲ طبع مصر

فرمایا ہے. جواب دیا کہ پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا کہ یہ سب قریش میں سے ہوں گے .

اسلام کی تاریخ میں ایسے بارہ خلفاء جو اسلام کی عزت کے محافظ اور نگہبان رہے ہوں ان بارہ اماموں کے علاوہ نہیں ملتے جن کو شیعہ اپنے امام مانتے ہیں کیونکہ جن بارہ خلفاء کا تعارف خود پیغمبر اکرمؐ نے کرایا تھا وہی آنحضرتؐ کے بلافصل خلیفہ شمار ہوتے ہیں.

اب دیکھنا یہ ہے کہ وہ بارہ افراد کون ہیں؟

اگر ہم ان چار خلفاء سے کہ جن کو اہل سنت خلفاء راشدین کہتے ہیں، چشم پوشی کر لیں تو دوسرے خلفاء میں سے کوئی بھی عزت اسلام کا باعث نہیں تھا جیسا کہ اموی اور عباسی خلفاء کی تاریخ اس بات کی شاہد ہے. لیکن شیعوں کے سبھی بارہ ائمہ اپنے اپنے زمانے میں تقوی اور پرہیز گاری کے پیکر تھے.

وہ سب پیغمبر اکرمؐ کی سنت کے محافظ تھے نیز وہ سب صحابہ کرام، تابعین اور بعد میں آنے والی نسلوں کی توجہ کا مرکز قرار پائے.

مورخین نے بھی انکے علم اور ان کی وثاقت کی صاف لفظوں میں گواہی دی ہے .

ان بارہ اماموں کے اسمائے گرامی درج ذیل ہیں:

۱۔امام علی ابن ابی طالب۔

۲۔امام حسن بن علی (مجتبیٰ) ۔

۳۔امام حسین بن علی۔

۴۔امام علی ابن الحسین (زین العابدین) ۔

۵۔امام محمد بن علی (باقر) ۔

۶۔امام جعفر بن محمد (صادق) ۔

۷۔امام موسیٰ بن جعفر (کاظم) ۔

۸۔امام علی بن موسیٰ (رضا) ۔

۹۔امام محمد بن علی (تقی) ۔

۱۰۔امام علی بن محمد (نقی) ۔

۱۱۔امام حسن بن علی (عسکری) ۔

۱۲۔امام مہدی (قائم) ۔

آپ کے سلسلے میں مسلمان محدثین نے پیغمبر اسلامؐ سے متواتر احادیث نقل کی ہیں کہ جن میں آپ کو مہدی موعود (جن کا وعدہ کیا گیا ہے) کے نام سے یاد کیا گیا ہے.

یہ وہ ائمہ معصومین ہیں کہ جنکے اسمائے مبارک پیغمبرؐ اسلام نے بیان فرمائے ہیں انکی زندگی سے متعارف ہونے کیلئے درج ذیل کتابوں کا مطالعہ مفید ثابت ہوگا:

۱ .تذکرۃ الخواص (تذکرۃ خواص الامہ(

۲. کفایۃ الاثر

۳. وفیات الاعیان

۴ .اعیان الشیعہ (سید محسن امین عاملی) یہ کتاب بقیہ کتابوں کی نسبت زیادہ جامع ہے.

پانچواں سوال

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر صلوات پڑھتے وقت کیوں آل کا اضافہ کرتے ہیں اور: اللّٰھم صل علی محمد

وآل محمد کہتے ہیں؟

جواب: یہ ایک مسلم اور قطعی بات ہے کہ خود پیغمبر اکرمؐ نے مسلمانوں کو درود پڑھنے کا یہ طریقہ سکھایا ہے جس وقت یہ آیۂ شریفہ:
)إِنَّ اللهَ وَمَلَائِكَتَهُ يُصَلُّونَ عَلَى النَّبِيِّ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا صَلُّوا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوا تَسْلِيمًا) (۱) نازل ہوئی تو مسلمانوں نے آنحضرتؐ سے پوچھا: ہم کس طرح درود پڑھیں؟
پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا: ''لاتُصلُّوا عليَّ الصلاة البتراء'' مجھ پر ناقص صلوات مت پڑھنا'' مسلمانوں نے پھر آنحضرتؐ سے سوال کیا: ہم کس طرح درود پڑھیں؟

)۱(سورہ احزاب آیت ۵۶
پیغمبر خداؐ نے فرمایا کہو: اللھم صلِّ علی محمد وآل محمد.(۱ (
اہل بیت ۲۲۲ قدر و منزلت کے ایک ایسے عظیم درجہ پر فائز ہیں جسے امام شافعی نے اپنے ان مشہور اشعار میں قلمبند کیا ہے:
یا أھل بیت رسول اللہ حبُّکم فرض من اللہ في القرآن انزلہ
کفاکم من عظیم القدر أنکم مَن لم یصلِّ علیکم لاصلاۃ لہ (۲(
ترجمہ: اے اہل بیت پیغمبرؐ آپ کی محبت کو خدا نے قرآن میں نازل کر کے واجب قرار دے دیا ہے. آپ کی قدر و منزلت کے لئے بس یہی کافی ہے کہ جو شخص بھی آپ پر صلوات نہ پڑھے اس کی نماز ہی نہیں ہوتی.

)۱ (الصواعق المحرقہ (ابن حجر) طبع دوم مکتبۃ القاہرہ مصر باب ۱۱ فصل اول ص ۱۴۶ اور ایسی روایت تفسیر
در المنثور جلد ۵ سورہ احزاب کی آیت ۵۶ کے ذیل میں بھی موجود ہے اس روایت کو صاحب تفسیر نے محدثین اور کتب صحاح اور کتب مسانید (جیسے عبد الرزاق، ابن ابی شبیہ، احمد، بخاری، مسلم، ابو داؤد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ اور ابن مردویہ) سے نقل کیا ہے۔ مذکورہ راویوں نے کعب ابن عجرہ سے اور انہوں نے رسول خداؐ سے نقل کیا ہے.
)۲ (الصواعق المحرقہ (ابن حجر) باب ۱۱ ص ۱۴۸ فصل اول اور کتاب اتحاف (شبراوی) ص ۲۹ اور کتاب
مشارق الانوار (حمزاوی مالکی) ص ۸۸ اور کتاب المواہب (زرقانی) اور کتاب الاسعاف (صبان) ص ۱۹۹.

چھٹا سوال

آپ اپنے اماموں کو معصوم کیوں کہتے ہیں؟

جواب: شیعوں کے ائمہ ۲۲۲ جو کہ رسولؐ کے اہل بیت ہیں ان کی عصمت پر بہت سی دلیلیں موجود ہیں. ہم ان میں سے صرف ایک دلیل کا یہاں پر تذکرہ کرتے ہیں:

شیعہ اور سنی دانشوروں نے یہ نقل کیا ہے کہ پیغمبر خداؐ نے اپنی زندگی کے آخری ایام میں یہ ارشاد فرمایا ہے:

''اِنی تارک فیکم الثقلین کتاب اللہ و اُھل بیتی وانھما لن یفترقا حتی یردا علیَّ الحوض۔''(۱(

میں تمہارے درمیان دو وزنی چیزیں چھوڑے جارہا ہوں ''کتاب خدا'' (قرآن) اور ''میرے اہل بیت'' یہ دونوں ہر گز ایک دوسرے سے جدا نہ ہوں گے یہاں تک کہ حوض کوثر پر

)۱ (مستدرک حاکم، جزء سوم ص۱۴۸۔اور الصواعق المحرقہ ابن حجر باب ۱۱ فصل اول ص۱۴۹ اور اسی سے ملتی جلتی روایات کنزالعمال جزء اول باب الاعتصام بالکتاب والسنۃ ص ۴۴،اور مسند احمد جزء پنجم ص ۱۸۹، ۱۸۲ اور دیگر کتب میں موجود ہیں.

میرے پاس پہنچیں گے.

یہاں پر ایک لطیف نکتہ یہ ہے کہ: قرآن مجید ہر قسم کے انحراف اور گمراہی سے محفوظ ہے اور یہ کیسے ممکن ہے کہ وحی الٰہی کی طرف غلطی اور خطا کی نسبت دی جائے جبکہ قرآن کو نازل کرنے والی ذات، پروردگار عالم کی ہے اور اسے لانے والا فرشتہ وحی ہے اور اسے لینے والی شخصیت پیغمبر خداؐ کی ہے اور ان تینوں کا معصوم ہونا آفتاب کی طرح روشن ہے اسی طرح سارے مسلمان یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ پیغمبر خداؐ وحی کے لینے، اس کی حفاظت کرنے اور اس کی تبلیغ کرنے کے سلسلے میں ہر قسم کے اشتباہ سے محفوظ تھے لھذا یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ جب کتاب خدا اس پائیدار اور محکم عصمت کے حصار میں ہے تو رسول خداؐ کے اہل بیت ۲۲۲ بھی ہر قسم کی لغزش اور خطا سے محفوظ ہیں کیونکہ حدیث ثقلین میں پیغمبر خداؐ نے اپنی عترت کو امت کی ہدایت اور رہبری کے اعتبار سے قرآن مجید کا ہم رتبہ اور ہم پلہ قرار دیا ہے. اور چونکہ عترت پیغمبرؐ اور قرآن مجید ایک دوسرے کے ہم پلہ ہیں لہذا یہ دونوں عصمت کے لحاظ سے بھی ایک جیسے ہیں دوسرے لفظوں میں یہ کہا جائے کہ غیر معصوم فرد یا افراد کو قرآن مجید کا ہم پلہ قرار دینے کی کوئی وجہ نہ تھی.

اسی طرح ائمہ معصومین ۲۲۲ کی عصمت کے سلسلے میں واضح ترین گواہ پیغمبر اکرم ﷺ کا یہ جملہ ہے:

"لن یفترقا حتی یردا علیّ الحوض".

یہ دوہر گز (ہدایت اور رہبری میں) ایک دوسرے سے جدا نہ ہوں گے یہاں تک کہ حوض کوثر پر مجھ سے آملیں گے.

اگر پیغمبر خداؐ کے اہل بیتؑ ہر قسم کی لغزشوں سے محفوظ نہ ہوں اور ان کے لئے بعض کاموں میں خطا کا امکان پایا جاتا ہو تو وہ قرآن مجید سے جدا ہو کر (معاذاللہ) گمراہی کے راستے پر چل پڑیں گے. کیونکہ قرآن مجید میں خطا اور غلطی کا امکان نہیں ہے لیکن رسول خداؐ نے انتہائی شدت کے ساتھ اس فرضیہ کی نفی فرمائی ہے.

البتہ یہ نکتہ واضح رہے کہ اس حدیث میں لفظ اہل بیت سے آنحضرتؐ کی مراد آپؐ کے تمام نسبی اور سببی رشتہ دار نہیں ہیں کیونکہ اس بات میں شک نہیں ہے کہ وہ سب کے سب لغزشوں سے محفوظ نہیں تھے.

لہذا آنحضرتؐ کی عترت میں سے صرف ایک خاص گروہ اس قسم کے افتخار سے سرفراز تھا اور یہ قدر و منزلت صرف کچھ گنے چنے افراد کے لئے تھی اور یہ افراد وہی ائمہ اہل بیت ۲۲۲ ہیں جو ہر زمانے میں امت کو راہ دکھانے والے، سنت پیغمبرؐ کے محافظ اور آنحضرتؐ کی شریعت کے پاسبان تھے۔

ساتواں سوال

اذان میں اشھد أن علیًّا ولي اللہ کیوں کہتے ہیں اور حضرت علی۔ کی ولایت کی شہادت کیوں دیتے ہیں؟

جواب: بہتر ہے کہ اس سوال کے جواب میں درج ذیل نکات کو مد نظر رکھا جائے:

ا۔ تمام شیعہ مجتہدین نے فقہ سے متعلق اپنی استدلالی یا غیر استدلالی کتابوں میں اس بات کو صراحت کیساتھ بیان کیا ہے کہ ولایت علی۔ کی شہادت اذان اور اقامت کا جزء نہیں ہے اور کسی بھی شخص کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ ولایت علیؑ کی شہادت کو اذان اور اقامت کا جزء سمجھ کر زبان پر جاری کرے.

۲۔ قرآن مجید کی نگاہ میں حضرت علی۔ ولی خدا ہیں اور خداوند عالم نے اس آیت میں مومنین پر حضرت علی۔ کی ولایت کو بیان کیا ہے:

)إِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللَّهُ وَرَسُولُهُ وَالَّذِينَ آمَنُوا الَّذِينَ يُقِيمُونَ الصَّلَاةَ وَيُؤْتُونَ الزَّكَاةَ وَهُمْ رَاكِعُونَ)(ا (

)ا(سورہ مائدہ آیت: ۵۵.

ایمان والو بس تمہارا ولی اللہ ہے اس کا رسول ہے اور وہ صاحبان ایمان جو نماز قائم کرتے ہیں اور حالت رکوع میں زکوۃ دیتے ہیں.

اہل سنت کی صحیح اور مسند کتابوں نے بھی اس بات کو صراحت کے ساتھ بیان کیا ہے کہ یہ آیۂ شریفہ حضرت علی۔ کی شان میں اس وقت نازل ہوئی تھی جب آپ نے اپنی انگشتر مبارک حالت رکوع میں فقیر کو عطا کی تھی(ا) جب یہ آیت حضرت امیر المومنین۔ کی شان میں نازل ہوئی تو شاعر اہل بیت ۲۲۲ حسان بن ثابت نے اس واقعے کو اس طرح اپنے اشعار میں ڈھالا تھا:

آپ وہ ہیں کہ جنہوں نے حالت رکوع میں بخشش کی اے بہترین رکوع کرنے والے آپ پر تمام قوم کی جانیں نثار ہو جائیں.

خداوند کریم کی ذات نے آپ کے حق میں بہترین ولایت نازل کی ہے اور اسے شریعتوں کے خلل ناپذیر احکام میں بیان کیا ہے.

)ا(اس سلسلے میں کہ یہ آیۃ حضرت علی۔ کی شان میں نازل ہوئی ہے بہت سی کتابیں موجود ہیں لیکن ان تمام

کتابوں کا یہاں تذکرہ ممکن نہیں ہے لیکن پھر بھی ہم ان میں سے بعض کی طرف اشارہ کرتے ہیں:

۱۔ تفسیر طبری جلد ۶ ص ۱۸۶.

۲۔ احکام القرآن (تفسیر جصاص) جلد ۲ ص ۵۴۲.

۳۔ تفسیر البیضاوی جلد ۱ ص ۳۴۵.

۴۔ تفسیر الدر المنثور جلد ۲ ص ۲۹۳.

۳۔ پیغمبر گرامی اسلامؐ نے فرمایا

''اِنّمَاالأعمال بالنیّات''

''بے شک اعمال کا دار مدار نیتوں پر ہے'.'

اس بناپر جب ''ولایت علیؑ'' ان اصولوں میں سے ایک ہے کہ جنہیں قرآن مجید نے صراحت کے ساتھ بیان فرمایا ہے، اور دوسری طرف سے اس جملہ (اشھدان علیاًولي الله) کو اذان کا جزء سمجھ کر نہ کہا جائے تو پھر ہمارے لئے رسالت پیغمبرؐ کی گواہی کے ہمراہ ولایت علیؑ کا بھی اعلان کرنے میں کیا حرج ہے ؟ یہاں پر ایک نکتہ کا ذکر ضروری ہے اور وہ یہ کہ اگر اذان میں کسی جملے کا اضافہ کرنا مناسب نہیں ہے اور اس کے ذریعہ شیعوں پر اعتراض کیا جاتا ہے تو ذیل میں بیان ہونے والی ان دو باتوں کی کس طرح توجیہ کی جائے گی:

۱۔ معتبر تاریخ گواہ ہے کہ یہ جملہ ''حيّ علیٰ خیر العمل'' اذان کا جزء تھا(۱) لیکن خلیفہ دوم نے اپنی خلافت کے زمانے میں یہ تصور کیا کہ کہیں لوگ اس جملے کو اذان میں سن کر یہ گمان نہ کر بیٹھیں کہ تمام اعمال کے درمیان صرف نماز ہی بہترین عمل ہے اور پھر جہاد پر جانا چھوڑ دیں گے لہذا اس جملے کو اذان سے حذف کر دیا اور پھر

)۱ (کتاب کنزالعمال، کتاب الصلوۃ جلد ۴ ص ۲۶۶ طبرانی سے منقول ہے: '' کان بلال یؤذن بالصبح فیقول: حی علی خیر العمل. ''بلال جب اذان صبح دیتے تھے تو کہتے تھے حيّ علیٰ خیر العمل. اور سنن بیہقی جلد ۱ ص ۴۲۴ اور ص ۴۲۵ اور مؤطا جلد ۱ ص ۹۳ میں بھی یہ بات درج ہے.

اذان اسی حالت پر باقی رہی. (۱(

۲۔ ''الصلاۃ خیر من النوم'' یہ جملہ رسول اکرمؐ کے زمانے میں اذان کا جزء نہیں تھا بعد میں یہ جملہ اذان میں بڑھایا گیا ہے (۲(

اسی وجہ سے امام شافعی نے اپنی کتاب ''الامّ'' میں کہا ہے:

''أکرہ في الأذان الصلاۃ خیر من النوم لأن أبا محذورہ لم یذکرہ''(۳(

اذان میں الصلوۃ خیر من النوم کہنا مجھے پسند نہیں ہے کیونکہ ابو محذورہ (جو کہ ایک راوی اور محدث ہیں) نے اس جملے کا (اپنی حدیث میں) ذکر نہیں کیا ہے۔

)۱ (کنزالعرفان جلد ۲ ص ۱۵۸ اور کتاب ''الصراط المستقیم'' وجواہر الاخبار والآثار اور شرح تجرید (قوشچی (
ص ۴۸۴ میں ہے کہ: صعد المنبر و قال: أیھاالناس ثلاث کنّ علی عھد رسول اللہ أنا أنھیٰ عنھنّ و أحرمھن و أُعاقب علیھن و ھی متعۃ النساء و متعۃ الحج و حیّ علیٰ خیر العمل''.

)۲ (کنزالعمال، کتاب الصلوۃ جلد ۴ ص ۲۷۰

)۳(دلائل الصدق جلد ۱۳ القسم الثانی ص ۹۷ سے ماخوذ.

آٹھواں سوال

مہدی آل محمد علیہ السلام کون ہیں اور انکا انتظار کیوں کیا جاتا ہے؟

جواب: کچھ امور ایسے ہیں جن کے سلسلے میں تمام آسمانی شریعتیں اتفاق نظر رکھتی ہیں ان میں سے ایک امر عالمی مصلح کا وجود بھی ہے جو کہ آخری زمانہ میں ظہور کرے گا اس سلسلے میں صرف مسلمان نہیں بلکہ یہودی اور عیسائی بھی اس کی آمد کے منتظر ہیں جو پوری دنیا میں عدل وانصاف قائم کریگا اسکے لئے اگر کتاب عہد عتیق اور عہد جدید کا مطالعہ کیا جائے تو حقیقت واضح ہو جائے گی. (۱(

اس سلسلہ میں پیغمبر خداؐ کی حدیث بھی موجود ہے کہ جسے مسلمان محدثین نے نقل کیا ہے چنانچہ فرماتے ہیں:

''لو لم یبق من الدھر إلا یوم لبعث اللہ رجلاً من

)۱ (عہد عتیق: مزامیر داؤد، مزمور ۹۷-۹۶ اور کتاب دانیال نبی باب ۱۲ عہد جدید: انجیل متی باب ۲۴ انجیل مرقوس باب ۱۳ انجیل لوقا باب ۲۱ (جہاں اس موعود کے بارے میں بیان ہوا ہے جس کے انتظار میں دنیا ہے(.

أھل بیتی یملأھا عدلا کما ملئت جوراً''(۱(

اگر زمانے کا صرف ایک ہی دن باقی بچے گا تب بھی خداوند عالم میرے خاندان میں سے ایک فرد کو مبعوث کرے گا جو کہ اس جہان کو اسی طرح سے عدالت سے بھر دے گا جس طرح وہ ظلم و ستم سے بھرا ہوا ہو گا.

جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں کہ دنیا میں ایک مصلح کے آنے کا عقیدہ تمام آسمانی شریعتوں میں موجود ہے اسی طرح اہل سنت کی صحیح اور مسند کتابوں میں بھی امام مھدی عج کے بارے میں بہت سی روایتیں نقل ہوئی ہیں اور ان دونوں (شیعہ اور سنی) اسلامی فرقوں کے محدثین اور محققین نے امام زمانہ عج کے بارے میں بہت سی کتابیں تحریر کی ہیں. (۲(

روایات کے اس مجموعے میں انکی وہ خصوصیات اور نشانیاں بیان ہوئی ہیں جو صرف شیعوں کے گیارہویں امام حسن عسکری۔ کے بلا فصل فرزند ہی میں پائی جاتی ہیں (۳) ان روایات کے مطابق امام مہدی۔ پیغمبر اکرمؐ کے ہم نام ہیں (۴)۔

)۱ (صحیح ابی داؤد جلد ۲ ص ۲۰۷ طبع مصر مطبعہ تازیہ، ینابیع المودۃ ص ۴۳۲ اور کتاب نور الابصار باب ۲ ص ۱۵۴.

)۲ (جیسے کتاب البیان فی اخبار صاحب الزمان تالیف محمد بن یوسف بن الکنجی الشافعی ہے اور اسی طرح کتاب البرھان فی علامات مھدی آخر الزمان تالیف علی بن حسام الدین جو کہ متقی ھندی کے نام سے مشہور ہیں اور اسی طرح کتاب المھدی والمھدویت تالیف احمد امین مصری ہے البتہ شیعہ علماء نے اس بارے میں بہت سی کتابیں لکھی ہیں جنہیں شمار کرنا آسان کام نہیں ہے جیسے کتاب الملاحم والفتن وغیرہ.

)۳ (ینابیع المودۃ باب ۷۶، مناقب میں جابر بن عبداللہ انصاری کی روایت ہے.

)۴ (صحیح ترمذی، مطبوعہ دہلی ۱۳۴۲ ، جلد ۲ ص ۴۶ اور مسند احمد مطبوعہ مصر ۱۳۱۳ ــــــ

یہاں اس نکتے کا ذکر ضروری ہے کہ اس قسم کی طولانی عمر نہ تو علم اور دانش کے خلاف ہے اور نہ ہی منطق وحی سے تضاد رکھتی ہے آج کی علمی دنیا انسانوں کی طبیعی عمر کو بڑھانا چاہ رہی ہے صاحبان علم اور سائنسدانوں کا یہ یقین ہے کہ ہر انسان کے اندر لمبی عمر گذارنے کی صلاحیت پائی جاتی ہے اور اگر اسے بعض آفتوں اور بیماریوں سے بچا لیا جائے تو قوی امکان ہے کہ اس کی عمر بڑھ جائیگی.

تاریخ نے بھی اپنے دامن میں ایسے افراد کے نام محفوظ کئے ہیں جنہوں نے اس دنیا میں طولانی عمر پائی ہے.

قرآن مجید حضرت نوح۔ کے بارے میں فرماتا ہے:

)فَلَبِثَ فِيهِمْ أَلْفَ سَنَةٍ إِلَّا خَمْسِينَ عَامًا)(۱ (

اور (نوح) اپنی قوم کے درمیان نو سو پچاس سال رہے.

اور اسی طرح قرآن مجید حضرت یونس۔ کے بارے میں فرماتا ہے:

)فَلَوْلَا أَنَّهُ كَانَ مِنَ الْمُسَبِّحِينَ لَلَبِثَ فِي بَطْنِهِ إِلَىٰ يَوْمِ يُبْعَثُونَ)(۲(

پھر اگر وہ تسبیح کرنے والوں میں سے نہ ہوتے تو روز قیامت تک اسی (مچھلی) کے شکم میں رہتے.

)۱ (سورہ عنکبوت آیت ۱۴

)۲ (سورہ صافات آیت ۱۴۴

اسی طرح قرآن مجید اور تمام مسلمانوں کے نظریہ کے مطابق حضرت خضر۔اور حضرت عیسیٰ۔ابھی تک باحیات ہیں اور زندگی گذار رہے ہیں۔

نواں سوال

اگر شیعہ حق پر ہیں تو وہ اقلیت میں کیوں ہیں؟

اور دنیا کے اکثر مسلمانوں نے ان کو کیوں نہیں مانا ہے؟

جواب: کبھی بھی حق اور باطل کی شناخت ماننے والوں کی تعداد میں کمی یا زیادتی کے ذریعہ نہیں ہوتی. آج اس دنیا میں مسلمانوں کی تعداد اسلام قبول نہ کرنے والوں کی بہ نسبت ایک پنجم یا ایک ششم ہے جبکہ مشرق بعید میں رہنے والوں کی اکثریت ایسے لوگوں کی ہے جو بت اور گائے کی پوجا کرتے ہیں یا ماورائے طبیعت کا انکار کرتے ہیں.

چین جس کی آبادی ایک ارب سے بھی زیادہ ہے کیمونیزم کا مرکز ہے اور ہندوستان جس کی آبادی تقریباً ایک ارب ہے اسکی اکثریت ایسے افراد کی ہے جو گائے اور بتوں کی پوجا کرتی ہے اسی طرح یہ ضروری نہیں ہے کہ اکثریت میں ہونا حقانیت کی علامت ہو قرآن مجید نے اکثر و بیشتر اکثریت کی مذمت کی ہے اور بعض اوقات اقلیت کی تعریف کی ہے اس سلسلے میں ہم چند آیات کو بطور نمونہ پیش کرتے ہیں:

۱۔(وَلاتَجِدُ أَکثَرَہُم شَاکِرِین)(۱(

اور تم اکثریت کو شکر گزار نہ پاؤ گے.

۲۔(اِنْ أَوْلِیَاؤُہُ اِلاَّ الْمُتَّقُونَ وَلَکِنَّ أَکثَرَہُم لایَعْلَمُونَ) (۲(

اس کے ولی صرف متقی اور پرہیز گار افراد ہیں لیکن ان کی اکثریت اس سے بھی بے خبر ہے.

۳۔(وَقَلِیلٌ مِنْ عِبَادِیَ الشَّکُورُ)(۳(

اور ہمارے بندوں میں شکر گزار بندے بہت کم ہیں.

لہذا کبھی بھی حقیقت کے متلاشی انسان کو اپنے آئین کی پیروی کرنے والوں کو اقلیت میں دیکھ کر گھبرانا نہیں چاہیئے اور اسی طرح اگر وہ اکثریت میں ہو جائیں تو فخر و مباہات نہیں کرنا چاہیئے بلکہ بہتر یہ ہے کہ ہر انسان اپنا چراغ عقل روشن کرے اور اس کی روشنی سے بہرہ مند ہو.

ایک شخص نے حضرت امیر المومنین علی۔ کی خدمت میں عرض کیا یہ کیسے ممکن ہے کہ جنگ جمل میں آپ کے مخالفین اکثریت پر ہونے کے باوجود باطل پر ہوں؟

امام۔نے فرمایا:

)۱(سورہ اعراف آیت ۱۷

)۲(سورہ انفال آیت ۳۴

)۳(سورہ سبا آیت ۱۳

''اِنّ الحق والباطل لایعرفان بأقدار الرجال. اعرف الحق تعرف أھلہ. اعرف الباطل تعرف أھلہ۔''

حق اور باطل کی پہچان افراد کی تعداد سے نہیں کی جاتی بلکہ تم حق کو پہچان لو خود بخود اہل حق کو بھی پہچان لوگے اور باطل کو پہچان لو تو خود بخود اہل باطل کو بھی پہچان لوگے.

ایک مسلمان شخص کیلئے ضروری ہے کہ وہ اس مسئلے کو علمی اور منطقی طریقے سے حل کرے اور اس آیۂ شریفہ (وَلاتَقْفُ مَالَیْسَ لَکَ بِہِ عِلْمٌ)(۱) کو چراغ کی مانند اپنے لئے مشعل راہ قرار دے اس سے ہٹ کر اگر دیکھا جائے تو اگرچہ اہل تشیع تعداد میں اہل سنت سے کم ہیں. لیکن اگر صحیح طور پر مردم شماری کی

جائے تو یہ معلوم ہو جائے گا کہ دنیا بھر کے مسلمانوں میں ایک چوتھائی افراد شیعہ ہیں جو کہ دنیا کے مختلف مسلمان نشین علاقوں میں زندگی بسر کر رہے ہیں.(۲(

واضح رہے کہ ہر دور میں شیعوں کے بڑے بڑے علماء اور مشہور مولفین اور مصنفین رہے ہیں اور یہاں پر یہ بھی واضح کر دینا ضروری ہے کہ اکثر اسلامی علوم کے موجد اور بانی شیعہ ہی تھے جن میں سے چند یہ ہیں :

علم نحو کے موجد ابوالاسود دئلی

)۱ (سورہ اسراء آیت ۳۶

)۲(زیادہ وضاحت کیلئے ''اعیان الشیعہ'' جلد ۱ بحث ۱۲ اور صفحہ ۱۹۴ کی طرف مراجعہ کیا جائے.

علم عروض کے بانی خلیل بن احمد

علم صرف کے موجد معاذ بن مسلم بن ابی سارہ کوفی

علم بلاغت کو فروغ دینے والوں میں سے ایک ابو عبداللہ بن عمران کاتب خراسانی

)مرزبانی)(۱(

شیعہ علماء اور دانشوروں کی کثیر تالیفات (جن کو شمار کرنا بہت دشوار کام ہے) کی شناخت کے لئے کتاب (الذریعہ الی تصانیف الشیعہ) کا مطالعہ مفید ثابت ہو گا.

)۱(اس بارے میں سید حسن صدر کی کتاب ''تاسیس الشیعہ'' کا مطالعہ کریں.

دسواں سوال

رجعت کیا ہے اور آپ اس پر کیوں عقیدہ رکھتے ہیں؟

جواب: عربی لغت میں رجعت کے معنی ہیں ''لوٹنا'' اسی طرح اصطلاح میں ''موت کے بعد اور قیامت سے پہلے کچھ انسانوں کے اس دنیا میں لوٹنے'' کو رجعت کہا جاتا ہے یہ رجعت حضرت مہدی۔ کے ظہور کے دور میں واقع ہو گی یہ ایک ایسی حقیقت ہے جو نہ تو عقل کے مخالف ہے اور نہ ہی منطق وحی کے بر خلاف ہے.

اسلام اور دوسرے ادیان الٰہی کی نظر میں انسان کے وجود میں جو چیز اصل ہے وہ اس کی روح ہے جسے ''نفس'' کے نام سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے یہی وہ چیز ہے جو بدن کے فنا ہو جانے کے بعد بھی باقی رہتی ہے اور اپنی جاودانہ زندگی بسر کرتی رہتی ہے اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ قرآن مجید کی نگاہ میں پروردگار عالم کی ذات قادر مطلق ہے اور کوئی بھی چیز اس کی لامحدود قدرت کو محدود نہیں کر سکتی.

ان دو مختصر مقدموں کی روشنی میں یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ رجعت کا مسئلہ عقل کی نگاہ سے ایک ممکن امر ہے کیونکہ تھوڑی سی فکر سے یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ انسانوں کے ایک گروہ کو اس دنیا میں دوبارہ واپس بھیجنا ان کی پہلی خلقت کی بہ نسبت کئی گنا زیادہ آسان ہے.

لہذا وہ پروردگار جس نے انہیں پہلے مرحلے میں خلق فرمایا ہے یقیناً ان کو دوبارہ اس دنیا میں لوٹانے پر قادر ہے اگر وحی الٰھی کی بنیاد پر رجعت کو گزشتہ امتوں میں تلاش کیا جائے تو اس کے مختلف نمونے مل سکتے ہیں.

قرآن مجید اس بارے میں فرماتا ہے:

)وَإِذْ قُلْتُمْ يَا مُوسَىٰ لَن نُّؤْمِنَ لَكَ حَتَّىٰ نَرَى اللَّهَ جَهْرَةً فَأَخَذَتْكُمُ الصَّاعِقَةُ وَأَنتُمْ تَنظُرُونَ ثُمَّ بَعَثْنَاكُم مِّن بَعْدِ مَوْتِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ)(۱(

اور وہ وقت بھی یاد کرو جب تم نے موسیٰ سے کہا کہ ہم اس وقت تک ایمان نہیں لائیں گے جب تک خدا کو آشکارا طور پر نہ دیکھ لیں جس کے بعد بجلی نے تم کو لے ڈالا اور تم دیکھتے ہی رہ گئے. پھر ہم نے تمہیں موت کے بعد زندہ کر دیا کہ شاید شکر گزار بن جاؤ.

اسی طرح قرآن مجید ایک اور مقام پر حضرت عیسی۔ کی زبان سے نقل کرتے ہوئے فرماتا ہے:

)وَأُحْيِي الْمَوْتَىٰ بِإِذْنِ اللَّهِ) (۲(

)۱ (سورہ بقرہ آیت: ۵۵۔۵۶

)۲(سورہ آل عمران آیت: ۴۹

اور میں خدا کی اجازت سے مردوں کو زندہ کروں گا.

قرآن مجید نے نہ صرف یہ کہ رجعت کو ایک ممکن امر قرار دیا ہے بلکہ انسانوں کے ایک ایسے گروہ کی تائید بھی کی جو اس دنیا سے جا چکا تھا اور پھر اس دنیا میں دوبارہ واپس آ گیا قرآن مجید نے مندرجہ ذیل دو آیتوں میں ان دو گروہوں کا تذکرہ کیا ہے جو مرنے کے بعد قیامت سے قبل دنیا میں واپس آئے ہیں.

)وَإِذَا وَقَعَ الْقَوْلُ عَلَيْهِمْ أَخْرَجْنَا لَهُمْ دَابَّةً مِنَ الْأَرْضِ تُكَلِّمُهُمْ أَنَّ النَّاسَ كَانُوا بِآيَاتِنَا لَا يُوقِنُونَ وَيَوْمَ نَحْشُرُ مِنْ كُلِّ أُمَّةٍ فَوْجًا مِمَّنْ يُكَذِّبُ بِآيَاتِنَا فَهُمْ يُوزَعُونَ)(۱

اور جب ان پر وعدہ پورا ہو گا تو ہم زمین سے ایک چلنے والی مخلوق کو نکال کر کھڑا کر دیں گے جو ان سے یہ بات کرے کہ کون لوگ ہماری آیات پر یقین نہیں رکھتے تھے. اور اس دن ہم ہر امت میں سے ان لوگوں کی ایک فوج اکھٹا کریں گے جو ہماری آیتوں کی تکذیب کیا کرتے تھے اور پھر ان کو روک لیا جائے گا.

ان دو آیتوں کے ذریعہ قیامت سے پہلے واقع ہونے والی رجعت کے سلسلے میں استدلال کرنے کے لئے مندرجہ ذیل نکات کی طرف توجہ ضروری ہے:

)۱(سورہ نمل آیت ۸۲ اور ۸۳.

۱۔ تمام مسلمان مفسرین کا یہ نظریہ ہے کہ یہ دو آیتیں قیامت سے متعلق ہیں اور پہلی آیت قیامت کی نشانیوں میں سے ایک نشانی کو بیان کر رہی ہے، اس سلسلے میں جلال الدین سیوطی نے اپنی تفسیر ''الدر المنثور'' میں ابن ابی شیبہ اور انہوں نے حذیفہ سے نقل کیا ہے کہ ''خروج دابۃ'' (چلنے والی مخلوق کا نکلنا) قیامت سے پہلے رونما ہونے

والے واقعات میں سے ایک ہے.(۱(

۲۔ اس بات میں کوئی شک وشبہ نہیں ہے کہ قیامت کے دن تمام انسانوں کو محشور کیا جائے گا، اور ایسا نہیں ہے کہ اس دن ہر امت میں سے ایک خاص گروہ کو محشور کیا جائے گا. قرآن مجید نے قیامت میں تمام انسانوں کے محشور ہونے کے بارے میں یوں فرمایا ہے:

)ذٰلِكَ يَوْمٌ مَجْمُوعٌ لَهُ النَّاسُ)(۲(

وہ ایک دن ہے جس میں تمام لوگ جمع کئے جائیں گے.(۳(

اور ایک جگہ فرماتا ہے:

)وَيَوْمَ نُسَيِّرُ الْجِبَالَ وَتَرَى الْأَرْضَ بَارِزَةً وَحَشَرْنَاهُمْ فَلَمْ نُغَادِرْ مِنْهُمْ أَحَدًا)(۴(

)۱(تفسیر در منثور جلد ۵ ص ۱۷۷۔ سورہ نمل کی آیت نمبر ۸۲ کی تفسیر کے ذیل میں.

)۲(سورہ ہود آیت: ۱۰۳

)۳(تفسیر در منثور جلد ۳ ص ۳۴۹۔ اس دن کی تفسیر قیامت سے کی گئی ہے۔

)۴(سورہ کہف آیت: ۴۷

اور جس دن ہم پہاڑوں کو حرکت میں لائیں گے اور تم زمین کو بالکل کھلا ہوا دیکھو گے اور ہم سب کو اس طرح جمع کریں گے کہ کسی ایک کو بھی نہیں چھوڑیں گے.

اس اعتبار سے قیامت کے دن تمام انسان محشور ہوں گے اور یہ بات انسانوں کے کسی خاص گروہ سے مخصوص نہیں ہے.

۳۔ان دو گذشتہ آیتوں میں دوسری آیت اس بات کا صریح اعلان کر رہی ہے کہ امتوں میں سے کچھ خاص افراد کو محشور کیا جائے گا اور تمام انسانوں کو محشور نہیں کیا جائے گا کیونکہ آیہ کریمہ میں ہے:

)ویوم نحشر من کل اُمۃ فوجاً ممن یُکذِّب بآیاتنا(

اور اس دن ہم ہر امت میں سے ان لوگوں کی ایک فوج اکھٹا کریں گے جو ہماری آیتوں کی تکذیب کیا کرتے تھے.

آیت کا یہ حصہ واضح طور پر اس بات کی گواہی دے رہا ہے کہ تمام انسانوں کو محشور نہیں کیا جائے گا.

نتیجہ: ان تین مختصر مقدموں کی روشنی میں یہ مطلب اچھی طرح واضح ہو جاتا ہے کہ آیات الٰہی کی تکذیب کرنے والے انسانوں میں سے ایک خاص گروہ کا محشور ہونا ایک ایسا واقعہ ہے جو قیامت سے پہلے واقع ہو گا اور یہی بات دوسری آیت سے بھی سمجھ میں آتی ہے.

کیونکہ قیامت کے دن کوئی خاص گروہ محشور نہیں ہو گا بلکہ اس دن تمام انسان محشور کئے جائیں گے اس بیان کے ساتھ ہمارا یہ دعوی صحیح ثابت ہو جاتا ہے کہ انسانوں کے ایک خاص گروہ کو ان کی موت کے بعد قیامت سے پہلے اس دنیا میں لوٹایا جائے گا اور اسی کا نام ''رجعت'' ہے.

اسی طرح اہل بیت پیغمبرؐ نے بھی جو ہمیشہ قرآن کے ہمراہ ہیں اور کلام الٰہی کے حقیقی مفسر ہیں اس سلسلے میں اپنی احادیث کے ذریعہ وضاحت فرمائی ہے یہاں پر ہم اختصار کی وجہ سے ان کے صرف دو ارشادات کی طرف اشارہ کرتے ہیں :

امام صادق۔ فرماتے ہیں:

''أیام اللہ ثلاثۃ یوم القائم۔ ویوم الکرّۃ، ویوم القیامۃ''

خدا کے تین دن ہیں حضرت امام مہدی۔ کا دن، رجعت کا دن، اور قیامت کا دن.

اور ایک مقام پر فرماتے ہیں:

''لیس منا مَن لم یؤمن بکرّتنا۔''

جو شخص ہماری رجعت کو قبول نہ کرے وہ ہم میں سے نہیں ہے.

آخر میں مناسب ہے کہ دو اہم نکتوں کو واضح کر دیا جائے:

۱۔ رجعت کا فلسفہ

رجعت کے اسباب و علل کے بارے میں غور کرنے سے دو اہم مقاصد سمجھ میں آتے ہیں. پہلا مقصد یہ ہے کہ رجعت کے ذریعہ اسلام کی حقیقی عزت و عظمت اور کفر کی ذلت کو آشکار کیا جائے اور دوسرا مقصد یہ ہے کہ باایمان اور نیک انسانوں کو ان کے اعمال کی جزا مل سکے اور کافروں اور ظالموں کو کیفر کردار تک پہنچایا جاسکے.

۲۔ رجعت اور تناسخ (۱) کے درمیان واضح فرق

یہاں پر اس بات کا ذکر ضروری ہے کہ شیعہ جس رجعت پر عقیدہ رکھتے ہیں: اس کا لازمہ تناسخ کا معتقد ہونا نہیں ہے کیونکہ نظریہ تناسخ کی بنیاد قیامت کے انکار پر ہے

اور تناسخ والے اپنے اس نظریئے کے مطابق دنیا کو دائمی طور پر گردش میں جانتے ہیں اور اس کا ہر دور اپنے پہلے والے دور کی تکرار ہے.

اس نظریئے کے مطابق انسان کے مرنے کے بعد اس کی روح دوبارہ اس دنیا میں پلٹتی ہے اور کسی دوسرے بدن میں منتقل ہو جاتی ہے اور اگر وہ روح گزشتہ زمانے میں کسی نیک آدمی کے جسم میں رہی ہو تو اب اس زمانے میں کسی ایسے آدمی کے بدن میں منتقل ہو جائے گی جس کی زندگی خوشی و مسرت کے ساتھ بسر ہونے والی ہو لیکن اگر

)۱(تناسخ: یعنی روح کا ایک بدن سے نکل کر دوسرے میں داخل ہو جانا جسے آواگون کہتے ہیں. (مترجم(

یہ روح گزشتہ زمانے میں کسی بدکار آدمی کے جسم میں رہی ہو تو اس زمانے میں ایسے آدمی کے بدن میں منتقل ہو جائے گی جس کی زندگی سختیوں میں گزرنے والی ہو اس نظریئے کے اعتبار سے روح کا اس طرح سے واپس لوٹنا ہی اسکی قیامت ہے.

جبکہ رجعت کا عقیدہ رکھنے والے اسلامی شریعت کی پیروی کرتے ہوئے قیامت اور معاد پر مکمل ایمان رکھتے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ اس بات کا عقیدہ بھی رکھتے ہیں کہ کسی روح کا ایک بدن سے کسی دوسرے بدن میں منتقل ہونا محال ہے (۱(

اہل تشیع صرف یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ انسانوں میں سے ایک گروہ قیامت سے پہلے اس دنیا میں واپس آئے گا اور چند حکمتوں اور مصلحتوں کے پورا ہو جانے کے بعد پھر اس دنیا سے چلا جائے گا. یہاں تک کہ یہ گروہ بھی باقی انسانوں کے ساتھ قیامت کے دن اٹھایا جائے گا. اس اعتبار سے روح ایک بدن سے جدا ہونے کے بعد ہر گز دوسرے بدن میں منتقل نہیں ہو گی۔

)۱(صدر المتالہین نے اپنی کتاب اسفار (جلد ۹ باب ۸ فصل اول ص ۳) میں نظریہ تناسخ کو باطل کرتے ہوئے یوں تحریر فرمایا ہے: اگر ایک بدن سے نکلی ہوئی روح کسی دوسرے بدن میں اس حالت میں داخل ہو جائے جبکہ وہ بدن ابھی جنین کی شکل میں رحم مادر میں ہے یا اس کے علاوہ کسی دوسرے مرحلہ میں ہو تو اس صورت میں یہ لازم آئے گا کہ ایک ہی چیز بالقوہ بھی ہو اور بالفعل بھی، اور جو چیز بالفعل ہے اس کا بالقوۃ ہونا محال ہے اس لئے کہ ان دونوں میں مادی و اتحادی ترکیب ہے اور ایسی ترکیب طبیعی محال ہے جس میں دو ایسے امر جمع ہو رہے ہوں

جن میں سے ایک بالفعل ہے اور دوسرا بالقوہ.

گیارہواں سوال

جس شفاعت کا آپ عقیدہ رکھتے ہیں وہ کیا ہے؟

جواب: شفاعت، اسلام کی ایک ایسی مسلم الثبوت اصل ہے جسے تمام اسلامی فرقوں نے قرآن کی آیات اور روایات کی پیروی کرتے ہوئے قبول کیا ہے بس صرف ان کے درمیان شفاعت کے نتیجے کے بارے میں اختلاف نظر ہے.

شفاعت کی حقیقت یہ ہے کہ ایک ایسا محترم انسان جو پروردگار کے نزدیک صاحب مقام و منزلت ہو وہ خداوند متعال سے کسی شخص کے گناہوں کی بخشش یا اس کے درجات کی بلندی کی دعا کرے.

رسول گرامی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

''أعطيت خمسًا... وأعطيت الشفاعة فادخرتها لأمتي''(۱(

)۱ (مسند احمد جلد ۱ ص ۳۰۱، صحیح بخاری جلد ۱ ص ۹۱ ط مصر.

پانچ چیزیں مجھے عطا کی گئی ہیں... اور شفاعت مجھے عطا ہوئی ہے جسے میں نے اپنی امت کے لئے ذخیرہ کر دیا ہے .

شفاعت کا دائرہ

قرآن مجید کی نگاہ میں وہ شفاعت صحیح نہیں ہے جو کسی قید اور شرط کے بغیر ہو بلکہ شفاعت صرف مندرجہ ذیل صورتوں میں مؤثر ہو گی:

۱۔ شفاعت کرنے والا اس وقت شفاعت کر سکتا ہے جب کہ اسے شفاعت کرنے کے لئے خداوند عالم کی جانب سے اجازت حاصل ہو لہذا صرف وہ لوگ شفاعت کر سکتے ہیں جنہیں خدا سے معنوی قربت بھی حاصل ہو اور وہ اذن شفاعت بھی رکھتے ہوں قرآن مجید اس بارے میں فرماتا ہے:

)لا يَمْلِكُونَ الشَّفَاعَةَ إِلاَّ مَنِ اتَّخَذَ عِنْدَ الرَّحْمَانِ عَهْدًا)(۱(

اس وقت کوئی شفاعت کے سلسلے میں صاحب اختیار نہ ہو گا مگر وہ جس نے رحمان کی بارگاہ میں شفاعت کا عہد لے لیا ہے.

اور ایک اور جگہ پر فرماتا ہے:

)یَوۡمَئِذٍ لَّا تَنفَعُ الشَّفَاعَةُ إِلَّا مَنۡ أَذِنَ لَهُ

)۱(سورہ مریم آیت: ۸۷

الرَّحۡمَٰنُ وَرَضِيَ لَهُ قَوۡلًا)(۱(

اس دن کسی کی سفارش کام نہ آئے گی سوائے ان کے جنہیں خدا نے اجازت دے دی ہو اور وہ ان کی بات سے راضی ہو.

۲۔ ضروری ہے کہ جو شخص شفاعت حاصل کرنا چاہتا ہے وہ شفاعت کرنے والے کے ذریعے فیض الٰہی کو لینے کی صلاحیت رکھتا ہو.

یعنی اس شخص کا خدا سے ایمانی رابطہ اور شفاعت کرنے والے سے روحانی رشتہ ٹوٹنے نہ پائے، لہذا کفار چونکہ خداوند کریم سے ایمانی رابطہ نہیں رکھتے اور اسی طرح بعض گنہگار مسلمان جیسے بے نمازی اور قاتل افراد چونکہ شفاعت کرنے والے سے روحانی رشتہ توڑ بیٹھے ہیں لہذا یہ سب شفاعت کے مستحق قرار نہیں پائیں گے.

قرآن مجید بے نمازی اور منکر قیامت کے بارے میں فرماتا ہے:

)فَمَا تَنفَعُهُمۡ شَفَاعَةُ الشَّافِعِينَ)(۲(

تو انہیں شفاعت کرنے والوں کی شفاعت بھی کوئی فائدہ نہ پہنچائے گی.

اور قرآن مجید ظالم افراد کے بارے میں فرماتا ہے:

)مَا لِلظَّالِمِينَ مِنۡ حَمِيمٍ وَلَا شَفِيعٍ يُطَاعُ)(۳(

)۱(سورہ طہ آیت: ۱۰۹

)۲(سورہ مدثر آیت: ۴۸

)۳(سورہ غافر آیت: ۱۸

اور ظالموں کیلئے نہ کوئی دوست ہوگا اور نہ ہی سفارش کرنے والا جس کی بات سن لی جائے.

شفاعت کا فلسفہ

شفاعت، توبہ کی طرح امید کا ایک دروازہ ہے جسے ایسے لوگوں کیلئے قرار دیا گیا ہے جو گناہ اور ضلالت کے راستے کو چھوڑ کر اپنی باقی ماندہ عمر کو خدا کی اطاعت میں گزارنا چاہتے ہیں کیونکہ جب بھی گنہگار انسان یہ احساس کرلے کہ صرف چند محدود شرطوں کیساتھ (نہ یہ کہ ہر حالت میں) شفاعت کرنیوالے کی شفاعت کا مستحق ہو سکتا ہے تو پھر وہ کوشش کریگا کہ ان شرطوں کا خیال رکھے اور سوچ سمجھ کر قدم اٹھائے.

شفاعت کا نتیجہ

مفسرین کے درمیان اس سلسلے میں اختلاف ہے کہ شفاعت کا نتیجہ گناہوں کی بخشش ہے یا اس کا نتیجہ بلندی درجات ہے لیکن اگر پیغمبر گرامیؐ کے اس ارشاد کو ملاحظہ کیا جائے جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں کہ :

''اِنّ شفاعتي يوم القيامة لأهل الكبائر من أمتي''(۱(

)۱(سنن ابن ماجہ جلد ۲ ص ۵۸۳، مسند احمد جلد ۳ ص ۲۱۳، سنن ابی داؤد جلد ۲ ص ۵۳۷، سنن ترمذی جلد ۴ ص ۴۵

''میری شفاعت قیامت کے دن میری امت کے ان افراد کے لئے ہو گی جو گناہان کبیرہ کے مرتکب ہوئے ہیں ''.

تو پہلا نظریہ زیادہ صحیح نظر آتا ہے۔

بارہواں سوال

کیا حقیقی شفاعت کرنے والوں سے بھی شفاعت کی درخواست کرنا شرک ہے؟

اس سوال کی وضاحت میں کہا جاتا ہے کہ شفاعت کرنا خدا کا مخصوص حق ہے جیسا کہ قرآن کریم اس بارے میں فرماتا ہے:

)قُل لِلّٰہِ الشَّفَاعَۃُ جَمِیعًا()۱(

کہہ دیجئے کہ شفاعت کا تمام تر اختیار اللہ کے ہاتھوں میں ہے.

لہذا غیر خدا سے شفاعت کی درخواست کرنے کا مطلب یہ ہے کہ خدا کے مطلق حق کو اس کے بندے سے مانگا جائے در حقیقت اس قسم کی درخواست غیر خدا کی عبادت کرنا ہے اور یہ ''توحید عبادی'' کے خلاف ہے.

جواب: یہاں اس کی ذات یا اس کی خالقیت اور اسکے مدبر ہونے میں شرک نہیں ہے یہاں شرک سے مراد اسکی عبادت میں شرک کرنا ہے.

)۱(سورہ زمر آیت ۴۴

واضح ہے کہ اس مسئلے کی وضاحت، عبادت کی صحیح تفسیر پر منحصر ہے اور ہم سب جانتے ہیں کہ عبادت کی تفسیر کرنے کا ہمیں اختیار نہیں دیا گیا تا کہ کہیں ہم مخلوق کے مقابلے میں ہر قسم کے خضوع اور کسی بندے سے کسی قسم کی درخواست کرنے کو عبادت قرار نہ دے بیٹھیں بلکہ قرآن مجید کی اس صراحت کے مطابق فرشتوں نے حضرت آدم کو سجدہ کیا ہے:

)فَإِذَا سَوَّیْتُہُ وَنَفَخْتُ فِیہِ مِن رُّوحِی فَقَعُوا لَہُ سَاجِدِینَ فَسَجَدَ الْمَلَائِکَۃُ کُلُّہُمْ أَجْمَعُونَ()۱(

جب میں اسے درست کرلوں اور اس میں اپنی روح پھونک دوں تو تم سب سجدے میں گرپڑنا. تو تمام ملائکہ نے سجدہ کرلیا.

یہ سجدہ اگرچہ خداوند عالم کے فرمان سے انجام پایا تھا پھر بھی یہ حضرت آدمؑ کی عبادت کے لئے نہ تھا ورنہ خداوند اس کے بجالانے کا حکم نہ دیتا.

اور اسی طرح ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ حضرت یعقوبؑ کے بیٹوں اور خود حضرت یعقوبؑ نے جناب یوسفؑ کو سجدہ کیا تھا:

)وَرَفَعَ اَبَوَیہِ عَلَی العَرشِ وَخَرُّوالَہُ سُجَّدًا)(۲(

اور انہوں نے والدین کو تخت کے اوپر پر جگہ دی اور سب لوگ یوسف کے سامنے سجدے میں گرپڑے.

اگر اس قسم کا خضوع حضرت یوسفؑ کی عبادت ہوتا تو اسے نہ تو حضرت یعقوبؑ

)۱(سورہ ص آیت: ۷۲اور ۷۳

)۲(سورہ یوسف آیت:۱۰۰

جیسے معصوم نبی بجالاتے اور نہ ہی اپنے بیٹوں کے اس کام سے راضی ہوتے جب کہ کوئی خضوع بھی سجدے سے بڑھ کر نہیں ہو سکتا اسی بنیاد پر ضروری ہے کہ ہم خضوع اور کسی غیر سے درخواست کرنے کو عبادت سے جدا سمجھیں.

عبادت کی حقیقت یہ ہے کہ انسان کسی موجود کو خدا تصور کرے اور پھر اس کی عبادت کرے یا کسی شے کو مخلوق خدا تو جانے لیکن یہ تصور کرے کہ خدائی امور جیسے کائنات کی تدبیر اور گناہوں کی بخشش اس شے کے سپرد کر دیئے گئے ہیں۔ لیکن اگر کسی شخص کے لئے ہمارا خضوع ایسا ہو کہ نہ تو ہم اسے خدا سمجھیں اور نہ ہی یہ تصور کریں کہ خدائی امور اس کے سپرد کر دیئے گئے ہیں تو ہمارا یہ خضوع اس کے احترام کے علاوہ اور کچھ نہ ہوگا بالکل ایسے ہی جیسے فرشتوں نے جناب آدم۔ اور جناب یعقوبؑ کے بیٹوں نے جناب یوسفؑ کا احترام کیا تھا یہی بات شفاعت کے سلسلے میں بھی کہی جائے گی کہ اگر یہ تصور کیا جائے کہ شفاعت کرنے کا حق پوری طرح سے ان شفاعت کرنے والوں کے سپرد کر دیا گیا ہے اور وہ بغیر کسی قید و شرط کے شفاعت کر سکتے ہیں اور گناہوں کی مغفرت کا سبب بن سکتے ہیں تو اس طرح کا عقیدہ شرک کا سبب بنتا ہے کیونکہ ہم نے خدا کے کام کو غیر خدا سے طلب کیا ہے لیکن جب بھی ہم تصور کریں کہ خدا کے کچھ پاک بندے ایسے ہیں جو شفاعت کے مالک تو نہیں ہیں لیکن کچھ مخصوص شرائط کے ساتھ گناہ گار بندوں کی شفاعت کرنے کی اجازت رکھتے ہیں کیونکہ شفاعت کی اہم ترین شرط یہی اذن اور رضایت پروردگار ہے تو واضح ہے کہ ایک صالح بندے سے اس طرح کی شفاعت طلب کرنے کا لازمہ یہ نہیں ہے کہ ہم اسے خدا مان بیٹھے ہیں اسی طرح اس کا لازمہ یہ بھی نہیں ہے کہ خدا کے امور اس کو سونپ دیئے گئے ہیں بلکہ ہم نے اس سے ایسے کام کی درخواست کی ہے جس کی وہ لیاقت رکھتا ہے ہم پیغمبر خداؐ کی حیات طیبہ میں اس بات کا مشاہدہ کرتے ہیں کہ گناہ گار افراد آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر مغفرت کی درخواست کرتے تھے. لیکن آنحضرتؐ کبھی بھی ان کی طرف شرک کی نسبت نہیں دیتے تھے. جیسا کہ سنن ابن ماجہ میں پیغمبر خداؐ سے ایک روایت موجود ہے کہ جس میں آپؐ فرماتے ہیں:

"أتدرون ما خيّرني ربي الليلة؟قلنا: الله ورسوله أعلم. قال: فإنه خيّرني بين أن يدخل نصف أمتي الجنة وبين الشفاعة فاخترت الشفاعة. قلنا يا رسول الله: ادع الله أن يجعلنا من أهلها قال هي لكل مسلم"(۱(

کیا تم جانتے ہو کہ آج کی رات میرے رب نے مجھے کن چیزوں کے درمیان اختیار دیا تھا؟ ہم نے کہا خدا اور اس کا رسولؐ بہتر جانتے ہیں. پیغمبرؐ نے فرمایا

اس نے مجھے اختیار دیا ہے کہ یا تو میری آدھی امت جنت میں چلی جائے یا پھر میں شفاعت کا حق لے لوں میں نے حق شفاعت کو اختیار کر لیا. ہم نے کہا اے پیغمبر خداؐ

)۱(سنن ابن ماجہ جلد ۲، باب ذکر الشفاعۃ ص ۵۸۶

اپنے پروردگار سے دعا کیجئے کہ ہمیں بھی شفاعت حاصل کرنے کے لائق بنادے. پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا: شفاعت ہر مسلمان کے لئے ہو گی.

اس حدیث سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اصحاب پیغمبرؐ آنحضرت سے شفاعت کی درخواست کیا کرتے تھے اسی لئے انہوں نے پیغمبرؐ سے کہا تھا "ادع اللہ"

قرآن مجید بھی فرماتا ہے:

)وَلَوْ اَنَّهُمْ اِذْ ظَّلَمُوا اَنْفُسَهُمْ جَاءُوكَ فَاسْتَغْفَرُوا اللّٰهَ وَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُوْلُ لَوَجَدُوا اللّٰهَ تَوَّابًا رَحِيْمًا()۱(

اور اے کاش جب ان لوگوں نے اپنے نفس پر ظلم کیا تھا تو آپ کے پاس آتے اور خود بھی اپنے گناہوں کے لئے استغفار کرتے اور رسول بھی ان کے حق میں استغفار کرتے تو یہ خدا کو بڑا ہی توبہ قبول کرنے والا اور مہربان پاتے.

اسی طرح قرآن مجید ایک اور مقام پر جناب یعقوبؑ کے بیٹوں کی درخواست کو نقل کرتے ہوئے فرماتا ہے:

)قَالُوا يٰٓاَبَانَا اسْتَغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا اِنَّا كُنَّا خٰطِـِٕيْنَ()۲(

)۱(سورہ نساء آیت: ۶۴

)۲(سورہ یوسف آیت: ۹۷

ان لوگوں نے کہا بابا جان اب آپ ہمارے گناہوں کے لئے استغفار کریں ہم یقیناً خطا کار تھے.

اور حضرت یعقوبؑ نے بھی ان کے لئے استغفار کرنے کا وعدہ کیا اور ہر گز اپنے بیٹوں پر شرک کا الزام نہیں لگایا.

)قَالَ سَوْفَ اَسْتَغْفِرُ لَكُمْ رَبِّيْ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ()۱(

انہوں نے کہا کہ میں عنقریب تمہارے حق میں استغفار کروں گا کہ میرا پروردگار بہت بخشنے والا اور مہربان ہے.

)۱(سورہ یوسف آیت: ۹۸

تیرہواں سوال

کیا غیر خدا سے مدد مانگنا شرک ہے؟

جواب: عقل اور منطق وحی کے اعتبار سے تمام انسان بلکہ کائنات کے تمام موجودات جس طرح وجود میں آنے کے لئے خدا کے محتاج ہیں اسی طرح دوسروں پر اثرانداز ہونے کے لئے بھی اس کے محتاج ہیں.

قرآن مجید اس بارے میں فرماتا ہے:

)یَاأَیُّهَاالنَّاسُ أَنْتُمُ الْفُقَرَاءُ إِلَی اللهِ وَاللهُ هُوَالْغَنِیُّ الْحَمِیدُ) (۱ (

اے لوگو تم سب اللہ کی بارگاہ کے فقیر ہو اور اللہ صاحب دولت اور قابل حمد وثنا ہے.

اسی طرح دوسری جگہ فرماتا ہے کہ ہر قسم کی فتح اور نصرت پروردگار جہان کے قبضۂ قدرت میں ہے.

)۱(سورہ فاطر آیت ۱۵

)وَمَاالنَّصْرُ إِلاَّ مِنْ عِنْدِاللهِ الْعَزِیزِالْحَکِیمِ)(۱(

مدد تو ہمیشہ صرف خدائے عزیز وحکیم ہی کی طرف سے ہوتی ہے.

اسلام کی اس مسلم الثبوت اصل کی بنیاد پر ہم سب مسلمان اپنی ہر نماز میں اس آیہ شریفہ کی تلاوت کرتے ہیں:

)إِیَّاکَ نَعْبُدُ وَإِیَّاکَ نَسْتَعِین(

ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھی سے مدد چاہتے ہیں.

اس مقدمہ کی روشنی میں اب ہم مذکورہ سوال کے جواب میں یہ کہنا چاہیں گے کہ : غیر خدا سے مدد مانگنا دو صورتوں میں قابل تصور ہے :

ا۔ پہلی صورت یہ ہے کہ ہم کسی انسان یا موجودات میں سے کسی سے اس طرح مدد مانگیں کہ اسے اس کے وجود یا اس کے اپنے کاموں میں مستقل سمجھیں اور اسے مدد پہنچانے میں خدا سے بے نیاز تصور کریں. ایسی صورت میں شک نہیں ہے کہ غیر خدا سے مدد مانگنا شرک ہوگا جیسے قرآن مجید درج ذیل آیت میں اس کو باطل قرار دیتا ہے.

)قُلْ مَنْ ذَاالَّذِي يَعْصِمُكُمْ مِنَ اللهِ إِنْ أَرَادَ بِكُمْ سُوءًا أَوْ أَرَادَ بِكُمْ رَحْمَةً وَلَا يَجِدُونَ لَهُمْ مِنْ دُونِ اللهِ وَلِيًّا وَلَا نَصِيرًا)(٢(

)٢(سورہ آل عمران آیت ١٢٦

)٢(سورہ احزاب آیت: ١٧

کہہ دیجئے کہ اگر خدا برائی کا ارادہ کرلے یا بھلائی ہی کرنا چاہے تو تمہیں اس سے کون بچا سکتا ہے اور یہ لوگ اس کے علاوہ نہ کوئی سرپرست پا سکتے ہیں اور نہ مددگار .

٢۔ دوسری صورت یہ ہے کہ کسی انسان سے مدد مانگتے وقت اسے خدا کی مخلوق اور

اس کا ضرورتمند بندہ سمجھا جائے اور یہ عقیدہ ہو کہ وہ اپنی طرف سے کسی قسم کا استقلال نہیں رکھتا اور اسے بندوں کی مشکلات کو حل کرنے کی صلاحیت خدا ہی نے عطا فرمائی ہے.

اس فکر کی رو سے اگر کسی چیز میں ہم اس انسان سے مدد مانگ رہے ہیں تو وہ اس سلسلے میں واسطے کا کام کرتا ہے کیونکہ پروردگار نے اسے بندوں کی حاجات کو پورا کرنے کے لئے ''وسیلہ'' قرار دیا ہے اس قسم کی مدد مانگنا حقیقت میں خداوند کریم سے مدد مانگنا ہے کیونکہ اسی نے ان وسائل اور اسباب کو وجود بخشا ہے اور اسی نے اس شخص کو انسانوں کی حاجات کو پورا کرنے کی صلاحیت اور قدرت عطا کی ہے اصولی طور پر بشر کی زندگی کی اساس ان اسباب اور مسببات سے مدد مانگنے پر استوار ہے اس طرح کہ ان سے مدد نہ لینے کی صورت میں انسان کی زندگی اضطراب کا شکار ہو جائیگی یہاں پر ہم اگر انہیں اس نگاہ سے دیکھیں کہ وہ خدا کی مدد پہنچانے کا وسیلہ ہیں اور ان کا وجود اور ان کی تاثیر خدا کی طرف سے ہے تو ان سے مدد مانگنا کسی بھی اعتبار سے توحید اور یکتا پرستی کے خلاف نہیں ہے.

ایک موحد اور خداشناس کسان جو کہ زمین پانی ہوا اور سورج سے مدد لے کر ایک بیج کو ایک پھل دار درخت میں تبدیل کر دیتا ہے تو حقیقت میں وہ کسان خدا سے مدد مانگتا ہے کیونکہ وہی ہے کہ جس نے ان اسباب کو قدرت اور استعداد بخشی ہے.

واضح ہے کہ یہ مدد مانگنا توحید اور یکتا پرستی سے پوری طرح مطابقت رکھتا ہے بلکہ قرآن مجید تو ہمیں بعض چیزوں (جیسے صبر اور نماز) سے مدد لینے کا حکم دیتا ہے اور فرماتا ہے:

)وَاسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلَاةِ)(١(

صبر اور نماز کے ذریعہ مدد مانگو.

واضح ہے کہ صبر اور پائیداری انسان کا کام ہے اور ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ ان سے مدد حاصل کریں جب کہ اس قسم کی استعانت خدا سے مانگی جانے والی اس

مدد کی مخالف نہیں ہے جسے اِیّاکَ نَستعینَ کے ذریعہ طلب کیا جاتا ہے۔

)۱(سورہ بقرہ آیت ۴۵

چودہواں سوال

کیا دوسروں کو پکارنا ان کی عبادت اور شرک ہے؟

جواب: اس قسم کے سوال کا سبب قرآن مجید کی وہ آیتیں ہیں جو اپنے ظاہری معنی کے اعتبار سے غیر خدا کو پکارنے سے روکتی ہیں:

)وَاَنَّ الْمَساجِدَ لِلّٰہِ فَلاتَدْعُوا مَعَ اللّٰہِ اَحَدًا)(۱(

اور مساجد سب اللہ کے لئے ہیں لہذا اس کے ساتھ کسی اور کو نہ پکارو.

)وَلاتَدْعُ مِنْ دُونِ اللّٰہِ مَالایَنْفَعُکَ وَلایَضُرُّکَ)(۲(

اور خدا کے علاوہ کسی ایسے کو آواز نہ دو جو نہ فائدہ پہنچا سکتا ہے اور نہ نقصان.

بعض لوگ اس قسم کی آیتوں کو سند بنا کر یہ کہتے ہیں کہ اولیائے خدا اور صالحین کو ان کے اس دنیا سے چلے جانے کے بعد پکارنا شرک اور ان کی عبادت ہے.

)۱(سورہ جن آیت: ۱۸

)۲(سورہ یونس آیت: ۱۰۶

جواب: اس سوال کے جواب میں مناسب یہ ہے کہ سب سے پہلے ان دو کلمات ''دعا'' اور ''عبادت'' کے معنی واضح کر دئے جائیں اس میں شک نہیں کہ عربی زبان

میں لفظ دعا کے معنی ندا اور پکارنے کے ہیں اور لفظ عبادت کے معنی پرستش کے ہیں اس اعتبار سے یہ دونوں الفاظ ہر گز ہم معنی نہیں ہیں یعنی یہ نہیں کہا جاسکتا کہ ہر ندا اور طلب عبادت اور پرستش ہے اس کی مندرجہ ذیل دلیلیں ہیں:

۱۔ قرآن مجید میں لفظ دعوت بعض ایسی جگہوں پر استعمال ہوا ہے جہاں ہر گز یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اس سے مراد عبادت ہے جیسے:

)قَالَ رَبِّ إِنِّي دَعَوْتُ قَوْمِي لَيْلًا وَنَهَارًا)(۱(

انہوں نے کہا پروردگار میں نے اپنی قوم کو دن میں بھی بلایا اور رات میں بھی.

کیا یہ کہا جاسکتا ہے کہ حضرت نوح۔ کی مراد یہ تھی کہ میں نے دن رات ان کی عبادت کی ہے.

لہذا یہ نہیں کہا جاسکتا کہ دعوت (پکارنا) اور عبادت ہم معنی کلمات ہیں لہذا اگر کوئی شخص پیغمبر اکرمؐ یا کسی اور صالح بندے سے مدد طلب کرے اور انہیں پکارے تو اس کا یہ عمل ان کی عبادت شمار نہیں کیا جائے گا کیونکہ دعوت کے معنی میں پرستش کی بہ نسبت زیادہ عمومیت ہے.

)۱ (سورہ نوح آیت: ۵

۲۔ آیات کے اس مجموعے میں دعا سے مراد ہر قسم کا پکارنا نہیں ہے بلکہ ایک خاص قسم کا پکارنا مقصود ہے جو کہ لفظ پرستش کا لازمہ ہو سکتا ہے کیونکہ یہ آیات ان بت پرستوں کے بارے میں آئی ہیں جو اپنے بتوں کو چھوٹے خدا تصور کرتے تھے. اس میں شک نہیں ہے کہ بت پرستوں کا خضوع ان کی دعا اور ان کی فریاد یہ سب ایسے بتوں

کے مقابلے میں تھا جنہیں وہ حق شفاعت اور مغفرت کا مالک سمجھتے تھے ان کی نگاہ میں یہ بت دنیا اور آخرت کے امور میں مستقل طور پر حق تصرف رکھتے تھے اب یہ بات بالکل واضح ہے کہ ان شرائط کے ساتھ ان موجودات کو پکارنا اور ان سے کسی قسم کی التجا کرنا ان کی عبادت شمار ہوگا کیونکہ وہ ان کو خدا کی حیثیت سے پکارتے تھے اور اس کا بہترین گواہ درج ذیل آیت ہے:

)فَمَا أَغْنَتْ عَنْهُمْ آلِهَتُهُمُ الَّتِي يَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ مِنْ شَيْءٍ)(۱(

عذاب کے آجانے کے بعد انکے وہ خدا بھی کام نہ آئے جنہیں وہ خدا کو چھوڑ کر پکار رہے تھے.

لہذا یہ آیتیں ہماری بحث سے کوئی ربط نہیں رکھتیں کیونکہ ہماری بحث کا موضوع ایک بندے کا دوسرے بندے سے کوئی التجا کرنا ہے جبکہ یہ بندہ اسے نہ تو اپنا خدا سمجھتا ہے اور نہ ہی اسے دنیا و آخرت کے امور میں اپنا مالک، تام الاختیار یا تصرف کرنے

)۱(سورہ ہود آیت: ۱۰۱.

والا مانتا ہے بلکہ اسے خدا کا ایسا معزز اور محترم بندہ سمجھتا ہے جسے پروردگار عالم نے منصب رسالت یا امامت سے نوازا ہے اور وعدہ کیا ہے کہ اس کی دعا کو

اپنے بندوں کے حق میں قبول کرے گا اس سلسلے میں خدا فرماتا ہے:

)وَلَوْ اَنَّهُمْ اِذْ ظَلَمُوا اَنْفُسَهُمْ جَاءُوكَ فَاسْتَغْفَرُوا اللّٰهَ وَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُولُ لَوَجَدُوا اللّٰهَ تَوَّابًا رَحِيمًا)(۲(

اور کاش جب ان لوگوں نے اپنے نفس پر ظلم کیا تھا تو آپ کے پاس آتے اور خود بھی استغفار کرتے اور رسول بھی ان کے حق میں استغفار کرتے تو یہ خدا کو بڑا ہی توبہ قبول کرنے والا اور مہربان پاتے.

۳۔ مذکورہ آیات اس بات پر شاہد ہیں کہ دعوت سے مراد ہر قسم کی درخواست اور حاجت نہیں ہے بلکہ اس دعوت سے مراد پرستش ہے اسی لئے ایک آیت میں لفظ دعوت کے بعد بلا فاصلہ اسی معنی کیلئے لفظ ''عبادت'' استعمال کیا گیا ہے

)وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُونِي اَسْتَجِبْ لَكُمْ اِنَّ الَّذِينَ يَسْتَكْبِرُونَ عَنْ عِبَادَتِي سَيَدْخُلُونَ جَهَنَّمَ دَاخِرِينَ)(۱(

)۱(سورہ نساء آیت: ۶۴.

)۲(سورہ غافر آیت ۶۰

اور تمہارے پروردگار کا ارشاد ہے کہ مجھ سے دعا کرو میں قبول کروں گا اور یقیناً جو لوگ میری عبادت سے اکڑتے ہیں وہ عنقریب ذلت کے ساتھ جہنم میں داخل ہوں گے.

جیسا کہ آپ نے ملاحظہ کیا اس آیت کے آغاز میں لفظ ''ادعونی'' ہے اور

اس کے ذیل میں لفظ ''عبادتی'' آیا ہے یہ اس بات پر شاہد ہے کہ ان آیتوں میں لفظ دعوت سے مراد وہ التجا و استغاثہ ہے جو ایسے موجودات سے کیا جاتا ہے جنہیں وہ خدا کی صفات سے متصف سمجھتے تھے۔.

نتیجہ: ان گزشتہ تین مقدموں کی روشنی میں ہم یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ ان آیات میں قرآن مجید کا بنیادی مقصد بت پرستوں کو بتوں کو پکارنے سے روکنا ہے وہ بت کہ

جنہیں وہ خدا کا شریک یا مدبر یا صاحب شفاعت جانتے تھے. کفار کا ان بتوں کے سامنے ہر قسم کا خضوع اور احترام یا گریہ اور استغاثہ کرنا اور ان سے شفاعت کا طلب کرنا یا پھر ان سے اپنی حاجت طلب کرنا یہ سب اس وجہ سے تھا کہ وہ ان بتوں کو چھوٹے خدا سمجھتے تھے اور انہیں خدا کے کاموں کو انجام دینے والا تصور کرتے تھے بت پرستوں کا یہ عقیدہ تھا کہ خدا نے دنیا اور آخرت کے متعلق بعض کام ان بتوں کو سونپ دئے ہیں اس اعتبار سے ان آیتوں کا ایک ایسے روح رکھنے والے انسان سے استغاثہ کرنے سے کیا تعلق ہے جو پکارنے والے کی نظر میں ذرہ برابر بھی بندگی کی حد سے باہر قدم نہیں رکھتا بلکہ اس کی نگاہ میں خداوند عالم کا محبوب و محترم بندہ ہے.

اگر قرآن مجید فرماتا ہے:

)وَاَنَّ الْمَسَاجِدَ لِلّٰهِ فَلَا تَدْعُوا مَعَ اللّٰهِ اَحَدًا)(۱(

''اور مساجد سب اللہ کے لئے ہیں لہذا اس کے ساتھ کسی اور کو نہ پکارو''.

تو اس سے مراد پرستش کے قصد سے پکارنا ہے کیونکہ زمانۂ جاہلیت کے عرب بتوں، ستاروں، فرشتوں، اور جنوں کی پوجا کیا کرتے تھے یہ آیت اور اس

قسم کی دوسری آیتیں کسی شخص یا کسی شے کو معبود سمجھ کر پکارنے سے متعلق ہیں اور اس میں شک نہیں کہ ان موجودات سے اس قسم کا عقیدہ رکھتے ہوئے کسی چیز کی درخواست کرنا ان کی عبادت شمار ہوگا لیکن ان آیتوں کا کسی ایسے شخص سے دعا کرنے سے کوئی تعلق نہیں ہے جس کے سلسلے میں دعا کرنے والا شخص اس کی ربوبیت یا الوہیت کا قائل نہیں ہے بلکہ اس شخص کو خدا کا بہترین اور محبوب بندہ سمجھتا ہے ؟

ممکن ہے کوئی یہ تصور کرے کہ اولیائے خدا کو صرف ان کی زندگی میں پکارنا جائز ہے اور ان کے اس دنیا سے چلے جانے کے بعد انہیں پکارنا شرک ہے.

اس سوال کے جواب میں ہم کہیں گے :

ا۔ ہم خاک میں سونے والے جسموں سے مدد نہیں مانگتے ہیں بلکہ ایسے نیک بندوں کی پاک ارواح (جیسے پیغمبرؐ اور اماموںؑ) سے مدد مانگتے ہیں جو قرآنی آیات کی

)ا (سورہ جن آیت ۱۸

صراحت کے مطابق زندہ ہیں اور شہداء سے بھی بلند و بالا مقام و منزلت کے ساتھ برزخ کی زندگی گزار رہے ہیں اور اگر ہم ان کی قبروں پر جا کر ان سے اس طرح کی درخواستیں کرتے ہیں تو یہ اس وجہ سے ہے کہ یہاں آکر ہم ان کی مقدس ارواح کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور ان سے رابطہ قائم کرتے ہیں اس سے بڑھ کر یہ کہ روایات کے مطابق یہ مقدس مقامات وہ ہیں جہاں دعائیں قبول ہوتی ہیں.

۲۔ ان اولیائے الٰہی کا بقید حیات ہونا یا حیات سے متصف نہ ہونا شرک یا توحید کی شناخت کا معیار نہیں ہے اور ہماری گفتگو شرک اور توحید کے معیار کے بارے میں ہے لیکن ان کو پکارنا فائدہ مند ہے یا نہیں ؟ تو یہ ہماری گفتگو سے خارج ہے.

البتہ اس مسئلے (کہ کیا اس قسم کے استغاثے فائدہ مند ہیں ؟) کے بارے میں گفتگو اس کی مناسب جگہ پر موجود ہے۔

پندرہواں سوال

''بداء'' کیا ہے اور آپ اس کا عقیدہ کیوں رکھتے ہیں؟

جواب: عربی زبان میں لفظ ''بداء'' کے معنی آشکار اور ظاہر ہونے کے ہیں اسی طرح شیعہ علماء کی اصطلاح میں ایک انسان کے نیک اور پسندیدہ اعمال کی وجہ سے اس کی تقدیر و سرنوشت میں تبدیلی کو ''بداء'' کہا جاتا ہے.

عقیدۂ بداء شیعیت کی آفاقی تعلیمات کے عظیم عقائد میں سے ایک ہے جسکی اساس وحی الٰہی اور عقلی استدلال پر استوار ہے. قرآن کریم کی نگاہ میں ایسا نہیں ہے کہ انسان کے ہاتھ اس کے مقدرات کے سامنے ہمیشہ کے لئے باندھ دیئے گئے ہوں بلکہ سعادت کی راہ اس کے لئے کھلی ہوئی ہے اور وہ راہ حق کی طرف پلٹ کر اپنے اچھے اعمال کے ذریعہ اپنی زندگی کے انجام کو بدل سکتا ہے اس حقیقت کو اس کتاب الٰہی نے ایک عمومی اور مستحکم اصل کے عنوان سے یوں بیان کیا ہے:

)إِنَّ اللهَ لا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتَّى يُغَيِّرُوا مَا بِأَنْفُسِهِمْ)(۱(

اور خداوند کسی قوم کے حالات کو اس وقت تک نہیں بدلتا جب تک وہ خود اپنے کو تبدیل نہ کرلے.

اور ایک جگہ فرماتا ہے:

)وَلَوْ أَنَّ أَهْلَ الْقُرَى آمَنُوا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَرَكَاتٍ مِنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ)(۲(

اور اگر اہل قریہ ایمان لے آتے اور تقوی اختیار کر لیتے تو ہم ان کے لئے زمین اور آسمان سے برکتوں کے راستے کھول دیتے.

اسی طرح حضرت یونسؑ کی سرنوشت کی تبدیلی کے بارے میں فرماتا ہے:

)فَلَوْلَا أَنَّهُ كَانَ مِنَ الْمُسَبِّحِينَ لَلَبِثَ فِي بَطْنِهِ إِلَى يَوْمِ يُبْعَثُونَ)(۳(

پھر اگر وہ تسبیح کرنے والوں میں سے نہ ہوتے تو روز قیامت تک اسی (مچھلی) کے شکم میں رہ جاتے.

اس آخری آیت سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ ظاہری اعتبار سے حضرت یونسؑ نبی کا قیامت تک اس خاص زندان میں باقی رہنا قطعی تھا لیکن ان کے نیک اعمال

)۱(سورہ رعد آیت: ۱۱

)۲(سورہ اعراف آیت: ۹۶

)۳(سورہ صافات آیت ۱۴۳اور ۱۴۴

)تسبیح پروردگار) نے ان کی سرنوشت کو بدل دیا اور انہیں اس سے نجات دلائی.

یہ حقیقت اسلامی روایات میں بھی بیان ہوئی ہے پیغمبر گرامیؐ اس بارے میں فرماتے ہیں:

"اِن الرجل لیُحرم الرزق بالذنب یصیبہ ولا یرد القدر

اِلا الدعاء ولا یزید فی العمر اِلا البرّ"(۱(

بے شک انسان گناہ کی وجہ سے اپنی روزی سے محروم ہو جاتا ہے ایسے موقع پر دعا کے علاوہ کوئی اور چیز اس کی تقدیر کو تبدیل نہیں کر سکتی اور نیکی کے علاوہ کوئی اور چیز اس کی عمر کو نہیں بڑھا سکتی.

یہ اور اس قسم کی دوسری روایتوں سے یہ بات اچھی طرح سمجھ میں آتی ہے کہ انسان گناہ کی بدولت روزی سے محروم ہو جاتا ہے؛ لیکن اپنے نیک اعمال (جیسے دعا مانگنے) کے ذریعہ اپنی سرنوشت کو بدل سکتا ہے اور نیکی کر کے اپنی عمر بڑھا سکتا ہے.

نتیجہ: قرآنی آیات اور سنت پیغمبرؐ سے استفادہ ہوتا ہے کہ اکثر اوقات ایسا ہوتا ہے کہ اس مادی دنیا کے اسباب و مسببات اور کاموں کے رد عمل سے بھی تقدیر بدل جاتی ہے یا اولیائے خدا (جیسے نبی یا امام) انسان کو خبر دے کہ اگر اس کا طرز عمل اسی طرح رہا تو اس کا مقدر یہ ہوگا لیکن اگر وہ یکبارگی کسی وجہ سے اپنے کردار کو سنوار لے تو

)۱ (مسند احمد جلد ۵ ص ۲۷۷ اور مستدرک حاکم جلد ۱ ص ۴۹۳ اور اسی کی مثل "التاج الجامع للاصول" جلد ۵

ص ۱۱۱ میں ہے. اپنی عاقبت کو تبدیل کر سکتا ہے.

اس حقیقت کو خدا کی وحی، پیغمبر اسلامؐ کی سنت اور عقل سلیم کے فیصلوں سے درس لے کر حاصل کیا گیا ہے۔ اور اسے شیعہ علماء بداء کے نام سے یاد کرتے ہیں.

یہاں پر اس بات کا واضح کر دینا مناسب ہوگا کہ "بداء" کی تعبیر عالم تشیع سے مخصوص نہیں ہے بلکہ یہ تعبیر پیغمبر اکرمؐ کی احادیث اور اہل سنت کی تحریروں میں بھی

دکھائی دیتی ہے نمونے کے طور پر ذیل کی حدیث ملاحظہ ہو جس میں پیغمبر اکرمؐ نے اس کلمہ کو استعمال فرمایا ہے:

"وبدا للہ عزّ وجلّ اَن یبتلیھم"(۱(

اس نکتے کا تذکرہ بھی ضروری ہے کہ بداء کے یہ معنی نہیں ہیں کہ خداوند کریم کے لامتناہی علم میں کسی قسم کی تبدیلی رونما ہوتی ہے کیونکہ خداوند کریم ابتداء ہی سے انسانی افعال کے فطری نتائج اور بدا کا موجب بننے والے عوامل سے بخوبی آگاہ ہے اس بات کی قرآن مجید نے بھی خبر دی ہے.

)یَمْحُوا اللّٰہُ مَا یَشَاءُ وَیُثْبِتُ وَعِنْدَہُ اُمُّ الْکِتَابِ)(۲(

اللہ جس چیز کو چاہتا ہے مٹا دیتا ہے یا برقرار رکھتا ہے کہ اصل

)۱(النہایہ فی غریب الحدیث والاثر، مؤلف مجد الدین مبارک بن محمد جزری جلد ا ص ۱۰۹

)۲(سورہ رعد آیت: ۳۹

کتاب اسی کے پاس ہے.

لہذا خداوند کریم ظہور بداء کے وقت اس حقیقت کو ہمارے لئے آشکار کرتا ہے جو ازل ہی سے اس کے علم میں تھی اسی وجہ سے امام صادق۔ فرماتے ہیں:

"مابدا الله في شيء إلا كان في علمه قبل أن يبدو له"(۱(

خداوند عالم کو کسی چیز میں بداء نہیں ہوتا ہے مگر یہ کہ ازل سے اس کو اس کا علم تھا.

بداء کا فلسفہ

اس میں شک نہیں کہ اگر انسان یہ جان لے کہ تقدیر کو بدلنا اس کے اختیار میں ہے تو وہ ہمیشہ اپنے مستقبل کو سنوارنے کے درپے رہے گا اور زیادہ سے زیادہ ہمت اور کوشش کے ساتھ اپنی زندگی کو بہتر بنانے کی کوشش کرے گا.

دوسرے لفظوں میں یہ کہا جائے کہ جس طرح توبہ اور شفاعت انسان کو ناامیدی اور مایوسی سے نجات دلاتی ہے اسی طرح بداء کا عقیدہ بھی انسان کے اندر نشاط اور شادابی پیدا کرتا ہے اور انسان کو روشن مستقبل کا امیدوار بناتا ہے کیونکہ اس عقیدے کی روشنی میں انسان یہ جان لیتا ہے کہ پروردگار عالم کے حکم سے وہ اپنی تقدیر کو بدل سکتا ہے اور ایک بہتر مستقبل حاصل کر کے اپنی عاقبت سنوار سکتا ہے۔

)۱ (اصول کافی جلد ا کتاب التوحید باب البداء حدیث نمبر ۹

سولہواں سوال

کیا شیعہ قرآن مجید میں تحریف کے قائل ہیں؟

جواب: شیعوں کے مشہور علماء کا یہ عقیدہ ہے کہ قرآن مجید میں کسی بھی قسم کی تحریف نہیں ہوئی ہے اور وہ قرآن جو آج ہمارے ہاتھوں میں ہے بعینہ وہی آسمانی کتاب ہے جو پیغمبر گرامی ﷺ پر نازل ہوئی تھی اور اس میں کسی قسم کی زیادتی اور کمی نہیں ہوئی ہے اس بات کی وضاحت کے لئے ہم یہاں چند شواہد کی طرف اشارہ کرتے ہیں:

۱۔ پروردگار عالم مسلمانوں کی آسمانی کتاب کی صیانت اور حفاظت کی ضمانت لیتے ہوئے فرماتا ہے:

)إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ)(۱(

ہم نے ہی اس قرآن کو نازل کیا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں.

)۱ (سورہ حجر آیت: ۹

واضح ہے کہ ساری دنیا کے شیعہ چونکہ قرآن مجید کو اپنے افکار اور کردار کے لئے

اساس قرار دیتے ہیں لہذا اس آیہ شریفہ کی عظمت کا اقرار کرتے ہوئے اس آیت میں موجود اس پیغام پر کامل ایمان رکھتے ہیں جو اس کتاب خدا کی حفاظت سے متعلق ہے.

۲۔ شیعوں کے عظیم الشأن امام حضرت علی۔نے جو ہمیشہ پیغمبر اکرم ﷺ کے ہمراہ رہے اور کاتبان وحی میں سے ایک تھے آپ سے لوگوں کو مختلف موقعوں اور مناسبتوں پر اسی قرآن کی طرف دعوت دی ہے ہم اس سلسلے میں ان کے کلام کے کچھ حصے یہاں پیش کرتے ہیں:

''واعلموا أن هذا القرآن هو الناصح الذي لا يغش والهادي الذي لا يضلّ'' (۱(

جان لو کہ یہ قرآن ایسا نصیحت کرنے والا ہے جو ہر گز خیانت نہیں کرتا اور ایسا رہنمائی کرنے والا ہے جو ہر گز گمراہ نہیں کرتا.

''إن الله سبحانه لم يعط أحداً بمثل هذا القرآن فإنه حبل الله المتين وسببه المبين''(۲(

بے شک خداوند سبحان نے کسی بھی شخص کو اس قرآن کے جیسی نصیحت عطا نہیں فرمائی ہے کہ یہی خدا کی محکم رسی اور اس کا واضح وسیلہ ہے.

)۱(نہج البلاغہ (صبحی صالح) خطبہ نمبر ۱۷۶

)۲(گذشتہ حوالہ.

''ثم أنزل علیہ الکتاب نوراً لا تطفأ مصابیحہ و سراجاً لا یخبو توقدہ. و منھاجاً لا یضل نھجہ. .. و فرقاناً لا یخمد برھانہ''(۱(

اور پھر آپؐ پر ایسی کتاب کو نازل کیا جس کا نور کبھی خاموش نہیں ہوگا اور جس کے چراغ کی لو کبھی مدھم نہیں پڑ سکتی وہ ایسا راستہ ہے جس پر چلنے والا کبھی بھٹک نہیں سکتا اور ایسا حق اور باطل کا امتیاز ہے جو کمزور نہیں پڑ سکتا.

شیعوں کے امام عالی شان امام حضرت امیر المومنین علی بن ابی طالب۔ کے گہر بار کلام سے یہ بات اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ قرآن مجید کی مثال ایک ایسے روشن چراغ کی ہے جو ہمیشہ اپنے پیروکاروں کے لئے مشعل راہ کا کام کرے گا. اور ساتھ ہی ساتھ اس میں کوئی ایسی تبدیلی نہیں ہوگی جو اس کے نور کے خاموش ہو جانے یا انسانوں کی گمراہی کا باعث ہو.

۳۔ شیعہ علماء اس بات پر اتفاق نظر رکھتے ہیں کہ پیغمبر اسلام ﷺ نے یہ ارشاد فرمایا ہے :

''میں تمہارے درمیان دو گراں قدر چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں ایک کتاب خدا (قرآن) ہے اور دوسرے میرے اہل بیت

)۱(نہج البلاغہ (صبحی صالح) خطبہ نمبر ۱۹۸

ہیں جب تک تم ان دو سے متمسک رہو گے ہر گز گمراہ نہیں ہو گے''.

یہ حدیث اسلام کی متواتر احادیث میں ایک ہے جسے شیعہ اور سنی دونوں فرقوں نے نقل کیا ہے.

اس بیان سے یہ بات اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ شیعوں کی نظر میں کتاب خدا میں ہر گز کسی قسم کی تبدیلی واقع نہیں ہو سکتی کیونکہ اگر قرآن مجید میں تحریف کا امکان ہوتا تو اس سے تمسک اختیار کر کے ہدایت حاصل کرنا اور گمراہی سے بچنا ممکن نہ ہوتا اور پھر اس کے نتیجہ میں قرآن اور حدیث ثقلین کے درمیان ٹکراؤ ہو جاتا.

۴. شیعوں کے اماموں نے اپنی روایات میں (جنہیں ہمارے تمام علماء اور فقہا نے نقل کیا ہے) اس حقیقت کو بیان کیا ہے کہ قرآن مجید حق و باطل اور صحیح و غلط کے درمیان فرق پیدا کرنے والا ہے لہذا ہر کلام حتی ہم تک پہنچنے والی روایات کے لئے ضروری ہے کہ انہیں قرآن مجید کے میزان پر تولا جائے اگر وہ قرآنی آیات کے مطابق ہوں تو حق ہیں ورنہ باطل. اس سلسلے میں شیعوں کی فقہ اور احادیث سے متعلق کتابوں میں بہت سی روایتیں ہیں ہم یہاں ان میں سے صرف ایک روایت کو پیش کرتے ہیں:

امام صادق۔ فرماتے ہیں:

''مالم یوافق من الحدیث القرآن فھو زخرف''(۱(

)۱ (اصول کافی جلد ۱ کتاب فضل العلم باب الاخذ بالسنۃ و شواہد الکتاب روایت نمبر ۴

ہر وہ کلام باطل ہے جو قرآن سے مطابقت نہ رکھتا ہو.

اس قسم کی روایات سے بھی یہ بات اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ قرآن مجید میں کسی بھی قسم کی تحریف نہیں کی جا سکتی اسی وجہ سے اس کتاب کی یہ

خاصیت ہے کہ وہ حق و باطل میں فرق پیدا کرنے والی ہے اور ہمیشہ باقی رہنے والی ہے.

۵. شیعوں کے بزرگ علماء نے ہمیشہ اسلام اور تشیع کی آفاقی تہذیب کی حفاظت کی ہے ان سب نے اس حقیقت کا اعتراف کیا ہے کہ قرآن مجید میں کبھی کوئی تحریف نہیں ہوئی ہے چوں کہ ان تمام بزرگوں کے نام تحریر کرنا دشوار کام ہے لہذا ہم بطور نمونہ ان میں سے بعض کا ذکر کرتے ہیں:

۱۔جناب ابو جعفر محمد بن علی بن حسین بابویہ قمی (متوفی ۳۸۱ ھ) جو ''شیخ صدوق'' کے نام سے مشہور ہیں فرماتے ہیں:

''قرآن مجید کے بارے میں ہمارا عقیدہ ہے کہ وہ خدا کا کلام ہے وہ ایک ایسی کتاب ہے جس میں باطل نہیں آسکتا وہ پروردگار حکیم و علیم کی بارگاہ سے نازل ہوا ہے اور اسی کی ذات اس کو نازل کرنے اور اس کی محافظت کرنے والی ہے.''(۱(

۲۔جناب سید مرتضیٰ علی بن حسین موسوی علوی (متوفی ۴۳۶ ھ) جو ''علم الہدیٰ'' کے نام سے مشہور ہیں فرماتے ہیں :

)۱ (الاعتقادات ص ۹۳

''پیغمبر اکرم ﷺ کے بعض صحابۂ کرام جیسے عبداللہ بن مسعود اور اُبیّ بن کعب وغیرہ نے بارہا آنحضرت ﷺ کے حضور میں قرآن مجید کو اول سے لے کر آخر تک پڑھا ہے یہ بات اس حقیقت کی گواہی دیتی ہے کہ قرآن مجید ترتیب کے ساتھ اور ہر طرح کی کمی یا پراگندگی کے بغیر اسی زمانے میں جمع کر کے مرتب کیا جا چکا تھا.''(۱(

۳۔جناب ابو جعفر محمد بن حسن طوسی (متوفی ۴۶۰ ھ) جو کہ شیخ الطائفہ کے نام سے مشہور تھے وہ فرماتے ہیں:

''قرآن مجید میں کمی یا زیادتی کا نظریہ کسی بھی اعتبار سے اس مقدس کتاب کے ساتھ مطابقت نہیں رکھتا کیونکہ تمام مسلمان اس بات پر اتفاق نظر رکھتے ہیں کہ قرآن مجید میں کسی طرح کی زیادتی واقع نہیں ہوئی ہے اسی طرح ظاہراً سارے مسلمان متفق ہیں کہ قرآن مجید میں کسی قسم کی کمی واقع نہیں ہوئی ہے اور یہ نظریہ کہ (قرآن میں کسی قسم کی کمی واقع نہیں ہوئی ہے) ہمارے مذہب سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے جناب سید مرتضیٰؒ نے بھی اس بات کی تائید کی ہے اور روایات کے ظاہری مفہوم سے بھی یہی بات ثابت ہوتی ہے کچھ لوگوں نے بعض ایسی روایتوں کی طرف اشارہ کیا ہے

)۱ (مجمع البیان جلد ا ص ۱۰ میں سید مرتضیٰ کی کتاب ''المسائل الطرابلیسیات'' سے نقل کرتے ہوئے.

جن میں قرآن مجید کی آیات میں کمی یا ان کے جابجا ہو جانے کا ذکر ہے ایسی روایتیں شیعہ اور سنی دونوں ہی کے یہاں پائی جاتی ہیں۔ لیکن چونکہ یہ روایتیں خبر واحد ہیں ان سے نہ تو یقین حاصل ہوتا ہے اور نہ ہی ان پر عمل کیا جا سکتا ہے. (۱) لہذا بہتر یہ ہے کہ اس قسم کی روایتوں سے روگردانی کی جائے۔''(۲(

۴۔جناب ابو علی طبرسی صاحب تفسیر ''مجمع البیان'' فرماتے ہیں :

''پوری امت اسلامیہ اس بات پر متفق ہے کہ قرآن مجید میں کسی بھی قسم کا اضافہ نہیں ہوا ہے اس کے برخلاف ہمارے مذہب کے کچھ افراد اور اہل سنت کے درمیان ''حشویہ'' فرقہ کے ماننے والے قرآن مجید کی آیات میں کمی کے سلسلے میں بعض روایتوں کو پیش کرتے ہیں لیکن جس چیز کو ہمارے مذہب نے مانا ہے جو صحیح بھی ہے وہ اس نظریہ کے برخلاف ہے.''(۳(

۵۔جناب علی بن طاؤس حلی (متوفی ۶۶۴ ھ) جو ''سید بن طاؤس'' کے نام سے مشہور ہیں فرماتے ہیں:

)۱ (ایسی روایت جو حد تواتر تک نہ پہنچتی ہو اور اس کے صدق کا یقین بھی نہ کیا جاسکتا ہو وہ خبر واحد کہلاتی ہے. (مترجم(

)۲(تفسیر تبیان جلد ۱ ص ۳.

)۳(تفسیر مجمع البیان جلد ۱ ص ۱۰.

''شیعوں کی نگاہ میں قرآن مجید میں کسی بھی قسم کی تبدیلی واقع نہیں ہوئی ہے''(۱(

۶۔جناب شیخ زین الدین عاملی (متوفی ۸۷۷ ھ) اس آیہ کریمہ:

)اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّکْرَ وَاِنَّا لَہُ لَحَافِظُونَ) کی تفسیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:

''یعنی ہم قرآن مجید کو ہر قسم کی تبدیلی اور زیادتی سے محفوظ رکھیں گے.''(۲(

۷۔کتاب احقاق الحق کے مؤلف سید نور اللہ تستری (شہادت ۱۰۱۹ ھ) جو کہ شہید ثالث کے لقب سے مشہور ہیں فرماتے ہیں:

''بعض لوگوں نے شیعوں کی طرف یہ نسبت دی ہے کہ وہ قرآن میں تبدیلی کے قائل ہیں لیکن یہ سارے شیعوں کا عقیدہ نہیں ہے بلکہ ان میں سے بہت تھوڑے سے افراد ایسا عقیدہ رکھتے ہیں اور ایسے افراد شیعوں کے درمیان مقبول نہیں ہیں.''(۳(

۸۔جناب محمد بن حسین (متوفی ۱۰۳۰ ھ) جو ''بہاء الدین عاملی'' کے نام سے

)۱ (سعد السعود ص ۱۱۴۴

)۲(اظہار الحق ج ۲ ص ۱۳۰

)۳(آلاء الرحمن ص ۲۵

مشہور ہیں فرماتے ہیں کہ:

'' صحیح یہ ہے کہ قرآن مجید ہر قسم کی کمی وزیادتی سے محفوظ ہے اور یہ کہنا کہ امیر المومنین علی۔کا نام قرآن مجید سے حذف کر دیا گیا ہے'' ایک ایسی بات ہے جو علماء کے نزدیک ثابت نہیں ہے جو شخص بھی تاریخ اور روایات کا مطالعہ کرے گا اس کو معلوم ہو جائے گا کہ قرآن مجید متواتر روایات اور پیغمبر اکرمؐ کے ہزاروں اصحاب کے نقل کرنے کی وجہ سے ثابت واستوار ہے اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں ہی پورا قرآن جمع کیا جاچکا تھا.'' (۱(

۹۔کتاب وافی کے مؤلف جناب فیض کاشانی (متوفی ۱۰۹۱ ھ) نے آیت (اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّکْرَ وَاِنَّا لَہُ لَحَافِظُونَ) کو اور اس جیسی آیتوں کو قرآن مجید میں عدم تحریف کی دلیل قرار دیتے ہوئے یوں لکھا ہے:

''اس صورت میں یہ کیسے ممکن ہے کہ قرآن مجید میں تحریف واقع ہو ساتھ ہی ساتھ تحریف پر دلالت کرنے والی روایتیں کتاب خدا کی مخالف بھی ہیں لہذا ضروری ہے کہ اس قسم کی روایات کو باطل سمجھا جائے.''(۲(

۱۰۔جناب شیخ حر عاملی (متوفی ۱۱۰۴ ھ) فرماتے ہیں کہ:

''تاریخ اور روایات کی چھان بین کرنے والا شخص اس بات کو

)۱(آلاءالرحمن ص ۲۵

)۲(تفسیر صافی جلد ا ص ۵۱

اچھی طرح سمجھ سکتا ہے کہ قرآن مجید، متواتر روایات اور ہزاروں صحابہ کرام کے نقل کرنے سے ثابت و محفوظ رہا ہے اور یہ قرآن پیغمبر اکرم ﷺ کے زمانے میں ہی منظم صورت میں جمع کیا جا چکا تھا.'' (۱(

۱۱۔ بزرگ محقق ''جناب کاشف الغطاء'' اپنی معروف کتاب ''کشف الغطاء'' میں لکھتے ہیں:

''اس میں شک نہیں کہ قرآن مجید خداوند کریم کی صیانت و حفاظت کے سائے میں ہر قسم کی کمی و تبدیلی سے محفوظ رہا ہے اس بات کی گواہی خود قرآن مجید بھی دیتا ہے اور ہر زمانے کے علماء نے بھی یک زبان ہو کر اس کی گواہی دی ہے اس سلسلے میں ایک مختصر سے گروہ کا مخالفت کرنا قابل اعتناء نہیں ہے .''

۱۲۔اس سلسلہ میں انقلاب اسلامی کے رہبر حضرت آیۃ اللہ العظمیٰ امام خمینی رحمۃ اللہ علیہ کا بیان بھی موجود ہے جسے ہم ایک واضح شاہد کے طور پر پیش کرتے ہیں:

ہر وہ شخص جو قرآن مجید کے جمع کرنے اس کی حفاظت کرنے، اس کو حفظ کرنے، اس کی تلاوت کرنے اور اس کے لکھنے کے بارے میں مسلمانوں کی احتیاط سے آگاہی رکھتا ہو وہ قرآن کے سلسلے میں نظریہ تحریف کے باطل ہونے کی گواہی دے گا اور وہ

)۱(آلاءالرحمن ص ۲۵

روایات جو اس بارے میں وارد ہوئی ہیں وہ یا تو ضعیف ہیں جن کے ذریعے استدلال نہیں کیا جا سکتا یا پھر مجہول ہیں جس سے ان کے جعلی ہونے کی نشاندہی ہوتی ہے یا یہ روایتیں قرآن کی تاویل اور تفسیر کے بارے میں ہیں یا پھر کسی اور قسم کی ہیں جن کے بیان کے لئے ایک جامع کتاب تالیف کرنے کی ضرورت ہے اگر موضوع بحث سے خارج ہونے کا خدشہ نہ ہوتا تو یہاں پر ہم قرآن کی تاریخ بیان کرتے اور ساتھ ہی ساتھ یہ بھی واضح کرتے کہ ان چند صدیوں میں اس قرآن پر کیسے حالات گزرے ہیں اور اس بات کو بھی روشن کر دیتے کہ جو قرآن مجید آج ہمارے ہاتھوں میں ہے وہ بعینہ وہی آسمان سے آنے والی کتاب ہے اور وہ اختلاف جو قرآن کے قاریوں کے درمیان پایا جاتا ہے وہ ایک جدید امر ہے جس کا اس قرآن سے کوئی تعلق نہیں ہے جسے لے کر جبرئیل امین۔ پیغمبر ﷺ کے قلب مطہر پر نازل ہوئے تھے.''(۱(

نتیجہ: مسلمانوں کی اکثریت خواہ وہ شیعہ ہوں یا سنی اس بات کی معتقد ہے کہ یہ آسمانی کتاب بعینہ وہی قرآن ہے جو پیغمبر خدا ﷺ پر نازل ہوئی تھی اور وہ ہر قسم کی تحریف، تبدیلی، کمی اور زیادتی سے محفوظ ہے.

)۱(تہذیب الاصول، جعفر سبحانی (دروس امام خمینی قدس سرہ) جلد ۲ ص ۹۶

ہمارے اس بیان سے شیعوں کی طرف دی جانے والی یہ نسبت باطل ہو جاتی ہے کہ وہ قرآن میں تحریف کے قائل ہیں اگر اس تہمت کا سبب یہ ہے کہ چند ضعیف روایات ہمارے ہاں نقل ہوئی ہیں تو ہمارا جواب یہ ہوگا کہ ان ضعیف روایات کو شیعوں کے ایک مختصر فرقے ہی نے نہیں بلکہ اہل سنت کے بہت سے مفسرین نے بھی اپنے ہاں نقل کیا ہے یہاں ہم نمونے کے طور پر ان میں سے بعض روایات کی طرف اشارہ کرتے ہیں:

۱۔ابو عبداللہ محمد بن احمد انصاری قرطبیؒ اپنی تفسیر میں ابو بکر انباری سے اور نیز

ابی بن کعب سے روایت کرتے ہیں کہ سورہ احزاب (جس میں تہتر آیتیں ہیں) پیغمبر ﷺ کے زمانے میں سورہ بقرہ (جس میں دو سو چھیاسی آیتیں ہیں) کے برابر تھا اور اسوقت اس سورہ میں آیہ ''رجم'' بھی شامل تھی.(۱(

)لیکن اب سورہ احزاب میں یہ آیت نہیں ہے)اور نیز اس کتاب میں عائشہ سے نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا:

''پیغمبر ﷺ کے زمانے میں سورۂ احزاب میں دو سو آیتیں تھیں پھر بعد میں جب مصحف لکھا گیا تو جتنی اب اس سورہ میں آیتیں ہیں ان سے زیادہ نہ مل سکیں'' (۲(

۲۔کتاب ''الاتقان'' کے مؤلف نقل کرتے ہیں کہ ''اُبیّ'' کے قرآن میں ایک سو سولہ

)۱(تفسیر قرطبیؒ جز۱۴ص۱۱۳سورہ احزاب کی تفسیر کی ابتداء میں.

)۲(گذشتہ حوالہ

سورے تھے کیونکہ اس میں دو سورے حفد اور خلع بھی تھے. جب کہ ہم سب جانتے ہیں کہ قرآن مجید کے سوروں کی تعداد ایک سو چودہ ہے اور ان دو سوروں (حفد اور خلع) کا قرآن مجید میں نام و نشان تک نہیں ہے. (۳(

۳۔ہبۃاللہ بن سلامہ اپنی کتاب ''الناسخ والمنسوخ'' میں انس بن مالک سے نقل کرتے ہیں کہ وہ کہتے ہیں: ''پیغمبر اکرمؐ کے زمانے میں ہم ایک ایسا سورہ پڑھتے تھے جو سورۂ توبہ کے برابر تھا مجھے اس سورہ کی صرف ایک ہی آیت یاد ہے اور وہ یہ ہے:

''لو أن لابن آدم واديان من الذهب لابتغىٰ إليهما ثالثاً ولو أن له ثالثاً لابتغىٰ إليهما رابعاً ولا يملأ جوف ابن آدم إلا التراب ويتوب الله علىٰ من تاب''!

جب کہ ہم سب جانتے ہیں کہ اس قسم کی آیت قرآن میں موجود نہیں ہے اور یہ جملے قرآنی بلاغت سے بھی مغایرت رکھتے ہیں.

۴۔ جلال الدین سیوطی اپنی تفسیر در المنثور میں عمر بن خطاب سے روایت کرتے ہیں کہ سورہ احزاب سورہ بقرہ کے برابر تھا اور آیہ ''رجم'' بھی اس میں موجود تھی(۲(

لہذا شیعہ اور سنی دونوں فرقوں کے کچھ افراد نے قرآن میں تحریف کے بارے

)۱ (اتقان جلد ا ص۶۷.

)۲(تفسیر در المنثور جلد ۵ ص۱۸۰ سورہ احزاب کی تفسیر کی ابتداء میں

میں ایسی ضعیف روایتوں کو نقل کیا ہے جنہیں مسلمانوں کی اکثریت نے خواہ وہ شیعہ ہوں یا سنی قبول نہیں کیا ہے.

بلکہ قرآن کی آیتوں، عالم اسلام کی صحیح اور متواتر روایتوں، اجماع، ہزاروں اصحاب پیغمبرؐ کے نظریات اور دنیا کے تمام مسلمانوں کا اس بات پر اتفاق ہے کہ قرآن مجید میں کسی بھی قسم کی تحریف، تبدیلی، کمی یا زیادتی نہ آج تک ہوئی ہے اور نہ ہی رہتی دنیا تک ہو گی۔

سترہواں سوال

صحابۂ کرام کے بارے میں شیعوں کا کیا نظریہ ہے؟

جواب: شیعوں کے نزدیک پیغمبر خداﷺ کو دیکھنے اور انکی مصاحبت سے شرفیاب ہونے والے افراد چند گروہوں میں تقسیم ہوتے ہیں لیکن اس بات کی وضاحت سے قبل بہتر یہ ہے کہ لفظ ''صحابی'' کو واضح کر دیا جائے صحابی پیغمبرؐ کی مختلف تعریفیں کی گئی ہیں یہاں ہم ان میں سے بعض تعریفوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں:

۱۔ سعید بن مسیب کہتے ہیں کہ: ''صحابی'' وہ ہے جو ایک یا دو سال تک پیغمبر خداؐ کی خدمت میں رہا ہو اور اس نے آنحضرتؐ کی ہمراہی میں ایک یا دو جنگیں بھی لڑی ہوں.(۱(

۲۔ واقدی کہتے ہیں کہ: علماء کے نزدیک ہر وہ شخص رسولؐ کا صحابی شمار ہوتا ہے جس نے آنحضرتؐ کو دیکھا ہو اور اسلام کی طرف مائل ہو اور اس نے دین اسلام کے سلسلے میں غور و فکر کرنے کے بعد اسے قبول کر لیا ہو اگرچہ وہ گھنٹہ بھر ہی آنحضرتؐ کے ہمراہ رہا ہو. (۲(

)۱ (اسد الغابۃ جلد ا ص ۱۱، ۱۲ طبع مصر

)۲(گذشتہ حوالہ

۳۔ محمد بن اسماعیل بخاری کہتے ہیں کہ : مسلمانوں میں سے ہر وہ شخص جو آنحضرتؐ کی مصاحبت میں رہا ہو یا اس نے آپؐ کو دیکھا ہو وہ آنحضرتؐ کے اصحاب میں شمار ہو گا.(۱(

۴۔احمد ابن حنبل کہتے ہیں کہ : ہر وہ شخص جو ایک ماہ یا ایک دن یا چند گھڑیاں پیغمبر اکرمؐ کے ہمراہ رہا ہو یا اس نے آنحضرتؐ کو دیکھا ہو وہ ان کے اصحاب میں شمار ہو گا.(۲(

علمائے اہل سنت کے نزدیک ''عدالت صحابہ'' ایک متفق علیہ مسئلہ ہے اس کے مطابق جس شخص کو بھی پیغمبر اکرمؐ کی مصاحبت حاصل ہوئی ہو وہ عادل ہے! (۳(

یہاں پر ضروری ہے کہ اس نظریہ کا قرآنی آیات کی روشنی میں تجزیہ کیا جائے اور ساتھ ہی ساتھ اس بارے میں وحی الٰہی کے سرچشمہ سے حاصل شدہ شیعوں کے نکتہ نظر کا بھی تذکرہ کیا جائے۔

تاریخ نے بارہ ہزار سے زیادہ افراد کے نام اصحاب پیغمبرؐ کی فہرست میں درج کئے ہیں جنکے درمیان مختلف قسم کے چہرے دکھائی پڑتے ہیں بے شک آنحضرتؐ کی مصاحبت ایک بہت بڑا افتخار تھا جو صرف چند افراد ہی کو نصیب ہوا اور امت اسلامی نے ہمیشہ ایسے افراد کو ادب واحترام کی نگاہوں سے دیکھا ہے کیونکہ انہی بزرگان نے

)۱ (اسد الغابۃ جلد ا ص ۱۱، ۱۲

)۲(گذشہ حوالہ

)۳ (الاستعیاب فی اسماء الاصحاب جلد ا ص ۲ ''الاصابۃ'' کے حاشیے میں اسد الغابۃ جلد ا صفحہ ۳ میں ابن اثیر سے نقل کرتے ہوئے.

آئین اسلام کی نمائندگی کرتے ہوئے سب سے پہلے اسلام کی عزت اور شوکت کے پرچم کو لہرایا ہے.

قرآن مجید نے بھی ان کی تعریف کرتے ہوئے یوں فرمایا ہے:

)لایَستَوِي مِنکُم مَن اَنفَقَ مِن قَبلِ الفَتحِ وَقَاتَلَ اُولٰئِکَ اَعظَمُ دَرَجَۃً مِنَ الذِینَ اَنفَقُوا مِن بَعدُ وَقَاتَلُوا(۱(

اور تم میں سے فتح سے پہلے انفاق کرنے والا اور جہاد کرنے والا اس کے جیسا نہیں ہو سکتا جو فتح کے بعد انفاق اور جہاد کرے پہلے جہاد کرنے والے کا درجہ بہت بلند ہے.

لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس بات کا اعتراف بھی کر لینا چاہیئے کہ پیغمبر خداؐ کی مصاحبت کوئی ایسا کیمیاوی نسخہ نہیں تھا جو انسانوں کی حقیقت کو بدل دیتا اور عمر کے آخری حصے تک ان کی زندگی کی ضمانت لیتا نیز انہیں ہمیشہ کے لئے عادلوں کی صف میں کھڑا کر دیتا .

اس مسئلے کی وضاحت کے لئے بہتر یہ ہے کہ ہم مسلمانوں کے درمیان قابل اعتماد کتاب قرآن مجید کا مطالعہ کریں اور اس سلسلے میں اس سے مدد حاصل

کریں.

صحابی قرآن مجید کی نگاہ میں

قرآن کے نکتہ نظر سے نبی اکرمؐ کی خدمت میں حاضر ہونے اور آپؐ کی مصاحبت

)۱ (سورہ حدید آیت: ۱۰

اختیار کرنے والوں کی دو قسمیں ہیں:

پہلی قسم

وہ ایسے اصحاب ہیں جن کی قرآن مجید کی آیتیں مدح وستائش کرتی ہیں اور انہیں شوکت اسلام کا بانی قرار دیتی ہیں یہاں پر ہم صحابہ کرام کے ایسے گروہ سے متعلق چند آیتوں کا ذکر کرتے ہیں:

۱۔ دوسروں پر سبقت لے جانے والے

)وَالسَّابِقُونَ الْأَوَّلُونَ مِنَ الْمُهَاجِرِينَ وَالْأَنصَارِ وَالَّذِينَ اتَّبَعُوهُم بِإِحْسَانٍ رَّضِيَ اللَّهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ وَأَعَدَّ لَهُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِي تَحْتَهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا ذَٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ)(۱(

اور مہاجرین اور انصار میں سے سبقت کرنے والے اور جن لوگوں نے نیکی میں ان کا اتباع کیا ہے ان سب سے خدا راضی ہو گیا ہے اور یہ سب خدا سے راضی ہیں اور خدا نے ان کے لئے وہ باغات مہیا کئے ہیں جن کے نیچے نہریں جاری ہیں اور یہ ان میں ہمیشہ رہنے والے ہیں اور یہی بہت بڑی کامیابی ہے.

)۱ (سورہ توبہ آیت:۱۰۰

۲۔ درخت کے نیچے بیعت کرنے والے

)لَقَدْ رَضِيَ اللَّهُ عَنِ الْمُؤْمِنِينَ إِذْ يُبَايِعُونَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ فَعَلِمَ مَا فِي قُلُوبِهِمْ فَأَنزَلَ السَّكِينَةَ عَلَيْهِمْ وَأَثَابَهُمْ فَتْحًا قَرِيبًا) (۱(

یقیناً خدا اصحاب ایمان سے اس وقت راضی ہو گیا جب وہ درخت کے نیچے آپ کی بیعت کر رہے تھے پھر اس نے وہ سب کچھ دیکھ لیا جو ان کے دلوں میں تھا تو ان پر سکون نازل کر دیا اور انہیں اس کے عوض قریبی فتح عنایت کر دی .

۳۔ مہاجرین

)لِلْفُقَرَاءِ الْمُهَاجِرِينَ الَّذِينَ أُخْرِجُوا مِن دِيَارِهِمْ وَأَمْوَالِهِمْ يَبْتَغُونَ فَضْلًا مِّنَ اللَّهِ وَرِضْوَانًا وَيَنصُرُونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ أُولَٰئِكَ هُمُ الصَّادِقُونَ)(۲ (

یہ مال ان مہاجر فقراء کے لئے بھی ہے جنہیں ان کے گھروں سے نکال دیا گیا اور ان کے اموال سے انہیں دور کر دیا گیا اور وہ

)۱(سورہ فتح آیت:۱۸

)۲(سورہ حشر آیت:۸

صرف خدا کے فضل اور اس کی مرضی کے طلب گار ہیں اور خدا اور رسول کی مدد کرنے والے ہیں یہی لوگ دعوائے ایمان میں سچے ہیں.

۴۔اصحابِ فتح

)مُّحَمَّدٌ رَّسُولُ اللَّهِ وَالَّذِينَ مَعَهُ أَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ تَرَاهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَبْتَغُونَ فَضْلًا مِّنَ اللَّهِ وَرِضْوَانًا سِيمَاهُمْ فِي وُجُوهِهِم مِّنْ أَثَرِ السُّجُودِ)(۱(

محمد اللہ کے رسول ہیں اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں وہ کفار کے لئے سخت ترین اور آپس میں انتہائی رحم دل ہیں تم ان کو دیکھو گے کہ بارگاہ احدیت میں سر خم کئے ہوئے سجدہ ریز ہیں اور اپنے پروردگار سے فضل و کرم اور اس کی خوشنودی کے طلب گار ہیں کثرت سجود کی وجہ سے ان کے چہروں پر سجدہ کے نشانات پائے جاتے ہیں.

دوسری قسم

بزم رسالت میں کچھ افراد ایسے بھی تھے جنہیں پیغمبر خداؐ کی مصاحبت تو حاصل ہوئی

)۱(سورہ فتح آیت:۲۹

تھی مگر وہ یا تو منافق تھے یا پھر ان کے دل میں مرض تھا قرآن مجید نے پیغمبر اسلامؐ کے لئے ایسے افراد کی حقیقت کو نمایاں کیا ہے اور آنحضرتؐ کو یہ تاکید کی ہے کہ ان سے محتاط رہیں یہاں پر ہم اس سلسلے میں نازل ہونے والی آیتوں کے چند نمونے پیش کرتے ہیں:

۱۔معروف منافقین

)إِذَا جَاءَكَ الْمُنَافِقُونَ قَالُوا نَشْهَدُ إِنَّكَ لَرَسُولُ اللَّهِ وَاللَّهُ يَعْلَمُ إِنَّكَ لَرَسُولُهُ وَاللَّهُ يَشْهَدُ إِنَّ الْمُنَافِقِينَ لَكَاذِبُونَ)(۱(

اے پیغمبر! یہ منافقین آپ کے پاس آتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپ اللہ کے رسول ہیں اور اللہ بھی جانتا ہے کہ آپ اس کے رسول ہیں لیکن اللہ گواہی دیتا ہے کہ یہ منافقین اپنے دعوے میں جھوٹے ہیں.

۲۔غیر معروف منافقین

)وَمِمَّنْ حَوْلَكُمْ مِنَ الْاَعْرَابِ مُنَافِقُونَ وَمِنْ اَهْلِ الْمَدِينَةِ مَرَدُوا عَلَى النِّفَاقِ لَا تَعْلَمُهُمْ نَحْنُ نَعْلَمُهُمْ)(۲(

)۱(سورہ منافقون آیت: ۱

)۲(سورہ توبہ آیت: ۱۰۱

اور تم لوگوں کے گرد، دیہاتیوں میں بھی منافقین ہیں اور اہل مدینہ میں تو وہ بھی ہیں جو نفاق میں ماہر اور سرکش ہیں تم لوگ ان کو نہیں جانتے ہو لیکن ہم خوب جانتے ہیں.

۳۔ دل کے کھوٹے

)وَاِذْ يَقُولُ الْمُنَافِقُونَ وَالَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ مَرَضٌ مَا وَعَدَنَا اللهُ وَرَسُولُهُ اِلَّا غُرُورًا)(۱(

اور جب منافقین اور جن کے دلوں میں مرض تھا یہ کہہ رہے تھے کہ خدا اور رسول نے ہم سے صرف دھوکا دینے والا وعدہ کیا ہے.

۴۔ گناہ گار

)وَآخَرُونَ اعْتَرَفُوا بِذُنُوبِهِمْ خَلَطُوا عَمَلًا صَالِحًا وَآخَرَ سَيِّئًا عَسَى اللهُ اَنْ يَتُوبَ عَلَيْهِمْ اِنَّ اللهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ)(۲(

اور دوسرے وہ لوگ جنہوں نے اپنے گناہوں کا اعتراف کیا کہ انہوں نے نیک اور بد اعمال مخلوط کر دیئے ہیں عنقریب خدا

)۱(سورہ احزاب آیت: ۱۲.

)۲(سورہ توبہ آیت: ۱۰۲.

ان کی توبہ قبول کرلے گا وہ بڑا بخشنے والا اور مہربان ہے.

قرآن مجید کی آیات کے علاوہ پیغمبر اکرمؐ سے بھی بعض صحابہ کی مذمت میں بہت سی روایات نقل ہوئی ہیں ان میں سے ہم صرف دو روایتوں کو بطور نمونہ پیش کرتے ہیں :

۱۔ ابو حازم، سہل بن سعد سے نقل کرتے ہیں کہ پیغمبر خداؐ نے ارشاد فرمایا:

"أنا فرطکم علی الحوض مَن ورد شرب و مَن شرب لم یظمأ أبداً لیردنّ علیّ أقوام أعرفهم ویعرفونني ثم یحال بیني وبینهم".

میں تم سب کو حوض کی طرف بھیجوں گا جو شخص بھی اس حوض تک پہنچے گا وہ اس میں سے ضرور پیئے گا اور جو بھی اس سے پیئے گا پھر وہ تا ابد پیاس محسوس نہیں کرے گا پھر ایک گروہ میرے پاس آئے گا جسے میں اچھی طرح پہچانتا ہوں گا اور وہ بھی مجھے پہچانتے ہوں گے اس کے بعد ان لوگوں کو مجھ سے جدا کر دیا جائے گا".

ابو حازم کا بیان ہے کہ جس وقت میں نے نعمان ابن ابی عیاش کے سامنے یہ حدیث پڑھی تو انہوں نے مجھ سے کہا: کیا تم نے یہ حدیث سھل سے اسی

طرح سنی ہے؟ میں نے کہاہاں اس وقت نعمان بن ابی عیاش نے کہا کہ ابو سعید خدری نے بھی اس حدیث کو ان کلمات کے اضافے کے ساتھ پیغمبر اکرمؐ سے نقل کیا ہے کہ آنحضرتؐ فرماتے ہیں:

"اِنھم مني فيقال: اِنک لاتدري ما أحدثوا بعدک فأقول سحقًا سحقًا لمن بدل بعدي"(۱(

یہ افراد مجھ سے ہیں پس کہا جائے گا کہ آپ نہیں جانتے کہ انہوں نے آپ کے بعد کیا کام انجام دیئے ہیں! پس میں کہوں گا ایسے لوگوں سے خدا کی رحمت دور ہو جائے جنہوں نے میرے بعد (احکام دین میں) تبدیلی کی.

پیغمبر اسلامؐ کی اس حدیث میں ان دو جملوں " جنہیں میں اچھی طرح پہچانتا ہوں گا اور وہ سب بھی مجھے پہچانتے ہونگے "اور "میرے بعد تبدیلی کی" سے صاف واضح ہے کہ آنحضرتؐ کی مراد آپکے وہ اصحاب ہیں جو کچھ مدت آنحضرتؐ کے ہمراہ رہے ہیں (اس حدیث کو بخاری اور مسلم نے بھی نقل کیا ہے(

۲۔ بخاری اور مسلم، پیغمبر خداؐ سے روایت کرتے ہیں کہ آنحضرتؐ نے فرمایا ہے:

"يرد عليَّ يوم القيامة رهط من أصحابي أو قال من أمتي فيحلون عن الحوض فأقول يارب أصحابي فيقول اِنّه لا علم لک بما أحدثوا بعدک أنھم ارتدوا علىٰ أدبارھم القھقری. "(۲(

)۱(جامع الاصول (ابن اثیر) جلد ۱ اکتاب الحوض فی ورود الناس علیہ ص ۱۲۰ حدیث نمبر ۷۹۷۲.

)۲(جامع الاصول جلد ۱۱ ص ۱۲۰ حدیث ۷۹۷۳

قیامت کے دن میرے اصحاب میں سے یا فرمایا میری امت میں سے ایک گروہ میرے پاس آئے گا پس ان کو حوض کوثر سے دور کر دیا جائے گا اس وقت میں کہوں گا اے میرے پروردگار! یہ میرے اصحاب ہیں تو خدا فرمائے گا آپ نہیں جانتے کہ انہوں نے آپ کے بعد کیسے کیسے کام انجام دیئے ہیں بے شک یہ لوگ اپنی سابقہ حالت (زمانہ جاہلیت) پر لوٹ کر مرتد ہو گئے تھے.

نتیجہ: قرآنی آیات اور سنت پیغمبر ﷺ کی روشنی میں یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اصحاب اور وہ افراد جنہیں آنحضرتؐ کی مصاحبت کا شرف حاصل ہوا ہے وہ سب ایک ہی درجہ کے نہیں تھے ان میں بعض ایسے بلند مقام افراد تھے جن کی خدمات نے اسلام کے پھیلانے میں انتہائی مؤثر کردار ادا کیا ہے لیکن بعض ایسے بھی تھے جو ابتداء ہی سے منافق، دل کے مریض اور گمراہ تھے. (۱(

اسی بیان کے ساتھ صحابۂ پیغمبرؐ کے بارے میں شیعوں کا نظریہ (جو در حقیقت قرآن اور سنت کا نظریہ ہے) واضح ہو جاتا ہے۔

)۱ (اس بارے میں مزید وضاحت کے لئے سورہ منافقون ملاحظہ کریں.

اٹھارہواں سوال

متعہ کیاہے اور شیعہ اسے کیوں حلال سمجھتے ہیں؟

جواب: نکاح، مرد اور عورت کے درمیان ایک ارتباط کا نام ہے. بعض اوقات یہ ارتباط دائمی ہوتا ہے اور عقد پڑھتے وقت اس میں زمانے کی کوئی قید ذکر نہیں کی جاتی لیکن بسا اوقات یہی ارتباط ایک معین مدت کے لئے انجام پاتا ہے یہ دونوں ہی عقد شرعی نکاح کی حیثیت رکھتے ہیں اور ان کے درمیان صرف ''دائمی'' اور ''موقت'' کا فرق ہوتا ہے لیکن یہ دونوں باقی خصوصیات میں مشترک ہیں اب ہم یہاں نکاح ''متعہ'' کی ان شرائط کا ذکر کریں گے جو نکاح ''دائم'' کی طرح معتبر ہیں:

۱۔ مرد اور عورت کے درمیان آپس میں کوئی نسبی و سببی اور کوئی شرعی مانع نہ ہو ورنہ ان کا عقد باطل ہے.

۲۔ طرفین کی رضامندی سے معین کئے جانے والے مہر کا تذکرہ عقد میں ہونا چاہئے.

۳۔ نکاح کی مدت معین ہونی چاہئے.

۴۔ شرعی طریقے سے عقد پڑھا جانا چاہئے.

۵۔ ان دونوں سے جو اولاد پیدا ہوگی وہ شرعی طور پر ان دونوں کی شمار ہوگی اور جس طرح نکاح دائم سے پیدا ہونے والی اولاد کا نام شناختی کارڈ وغیرہ میں درج ہوتا ہے اسی طرح عقد متعہ سے پیدا ہونے والی اولاد کا نام بھی شناختی کارڈ میں شامل کیا جاتا ہے.

۶۔ اس اولاد کا نان و نفقہ والد کے ذمے ہے اور یہ اولاد ماں اور باپ دونوں سے میراث پائے گی.

۷۔ جس وقت عقد متعہ کی مدت ختم ہو جائے تو اگر عورت یائسہ نہ ہو تو وہ شرعی طور پر عدہ گزارے گی اور اگر اثنائے عدت میں یہ معلوم ہو جائے کہ وہ حاملہ ہے تو وضع حمل سے پہلے کسی بھی قسم کا عقد نہیں کر سکتی. اسی طرح نکاح دائم کے باقی احکام بھی متعہ میں جاری ہوں گے ان دونوں میں فرق صرف یہ ہے کہ چونکہ عقد متعہ چند ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے حلال کیا گیا ہے لہذا اس عورت کا نان ونفقہ مرد کے ذمے نہیں ہے اور اگر عقد متعہ پڑھتے وقت عورت کی طرف سے میراث لینے کی شرط نہ لگائی جائی تو یہ عورت شوہر کی میراث نہیں پائے گی واضح ہے کہ ان دو فرقوں سے نکاح کی حقیقت میں کوئی اثر نہیں پڑتا۔

ہم سب اس بات کے معتقد ہیں کہ اسلام ایک دائمی شریعت اور آخری شریعت ہے لہذا اس کیلئے ضروری ہے کہ وہ انسانوں کی تمام ضرورتوں کو پورا کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو اب یہاں پر اس بات کی طرف توجہ ضروری ہے کہ ایک ایسا جوان شخص جو کہ تعلیم حاصل کرنے کیلئے کسی دوسرے شہر یا ملک میں زندگی بسر کر رہا ہو اور محدود وسائل کی وجہ سے دائمی عقد نہ کر سکتا ہو اسکے سامنے صرف تین راستے ہیں اور ان میں سے وہ کسی ایک کا انتخاب کرے گا۔

الف: کنوارہ ہی رہے.

ب: گناہ اور آلودگی کی دلدل میں دھنس جائے.

ج: گذشتہ شرائط کے ساتھ ایک ایسی عورت کے ساتھ ایک محدود اور معین مدت کے لئے شادی کر لے جس سے شرعا عقد جائز ہو. پہلی صورت کے بارے میں یہ کہنا چاہئے اس میں اکثر افراد شکست کھا جاتے ہیں اگرچہ بعض ایسے انگشت شمار اشخاص ضرور مل جائیں گے جو اپنی خواہشات کو دبا کر صبر کا دامن تھام لیتے ہیں لیکن اس روش پر عمل پیرا ہونا سب کے بس کی بات نہیں ہے.

دوسرے راستے کو اختیار کرنے والوں کا انجام تباہی کے سوا کچھ بھی نہیں ہوتا اور اسلام کی نگاہ میں بھی یہ ایک حرام عمل ہے. اس فعل کو فطری تقاضے کا نام دے کر صحیح قرار دینا ایک غلط فکر ہے .

اب صرف تیسرا راستہ بچتا ہے جسے اسلام نے پیش کیا ہے اور یہی مناسب اور صحیح بھی ہے پیغمبر خداؐ کے زمانے میں بھی اس پر عمل ہوتا رہا ہے اس مسئلے میں اختلاف آنحضرتؐ کے بعد پیدا ہوا ہے.

یہاں پر اس بات کا ذکر ضروری ہے کہ وہ لوگ جو عقد متعہ سے خوف وہراس رکھتے ہیں انہیں اس بات کی طرف بھی توجہ کرنی چاہیے کہ تمام اسلامی مجتہدین اور محققین نے اس متعہ کو معنوی اعتبار سے نکاح دائم میں بھی اس طرح میں قبول کیا ہے کہ جب مرد اور عورت آپس میں عقد دائم تو کریں لیکن ان کی نیت یہ ہو کہ ایک سال کے بعد یا اس سے کمتر یا بیشتر مدت میں ایک دوسرے سے جدا ہو جائیں گے تو وہ طلاق کے ذریعہ جدا ہو سکتے ہیں.

واضح ہے کہ اس قسم کی شادی ظاہری اعتبار سے تو دائمی ہے لیکن حقیقت میں معین وقت کے لئے ہے اور اس قسم کے دائمی نکاح اور عقد متعہ کے درمیان صرف یہ فرق ہے کہ عقد متعہ ظاہری اور باطنی ہر دو اعتبار سے معین وقت کے لئے ہوتا ہے جبکہ اس قسم کا دائمی نکاح ظاہری طور پر تو ہمیشہ کے لئے ہے لیکن باطنی طور پر ایک محدود وقت کے لئے انجام پایا ہے.

وہ لوگ جو اس قسم کے دائمی نکاح کو جائز سمجھتے ہیں جیسا کہ اس کو تمام مسلمان فقہاء جائز قرار دیتے ہیں تو وہ عقد متعہ کو حلال سمجھنے میں کیوں خوف وہراس محسوس کرتے ہیں. یہاں تک ہم نے عقد متعہ کی حقیقت سے آشنائی حاصل کی اب ہم دلیلوں کی روشنی میں اس کے جواز کو ثابت کریں گے اس سلسلے میں ہم دو مرحلوں میں بحث کریں گے:

۱۔ صدر اسلام میں عقد متعہ کا شرعا جائز ہونا.

۲۔ رسول خداؐ کے زمانے میں اس حکم شرعی کا منسوخ نہ ہونا.

عقد متعہ کا جواز اس آیۂ شریفہ سے ثابت ہوتا ہے:

)فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهِ مِنْهُنَّ فَآتُوهُنَّ أُجُورَهُنَّ فَرِيضَةً)(۱(

پس جب بھی تم ان عورتوں سے متعہ کرو تو انکی اجرت انہیں بطور فریضہ دے دو.

اس آیہ شریفہ کے الفاظ اچھی طرح اس بات کے گواہ ہیں کہ یہ آیۂ کریمہ نکاح موقت کے بارے میں نازل ہوئی ہے کیونکہ:

اول: اس آیت میں استمتاع کا لفظ استعمال کیا گیا ہے جس کے ظاہری معنی نکاح موقت ہیں. اور اگر اس سے مراد دائمی نکاح ہوتا تو اس کیلئے قرینہ لایا جاتا.

دوم: اس آیت میں کلمہ ''اجورھن'' (ان کی اجرت) ہے اور یہ اس بات کا گواہ ہے کہ اس آیت سے مراد عقد متعہ ہے کیونکہ نکاح دائم میں لفظ ''مہر'' اور لفظ ''صداق'' استعمال کئے جاتے ہیں.

سوم: شیعہ اور سنی مفسرین اس بات کے معتقد ہیں کہ یہ آیۂ شریفہ عقد متعہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے جلال الدین سیوطی اپنی تفسیر درالمنثور میں ابن جریر اور سدی سے نقل کرتے ہیں کہ یہ آیت عقد متعہ کے بارے میں ہے(۲(

اسی طرح ابو جعفر محمد بن جریر طبری اپنی تفسیر میں سدی اور مجاہد اور ابن عباس سے نقل کرتے ہیں کہ یہ آیت نکاح موقت کے بارے میں ہے(۳(

)۱(سورہ نساء آیت: ۲۴.

)۲(تفسیر درالمنثور جلد ۲ ص ۱۴۰ سورہ نساء کی ۲۴ ویں آیت کے ذیل میں.

)۳(جامع البیان فی تفسیر القرآن جزء ۵ ص ۹.

چہارم: صاحبان صحاح و مسانید اور احادیث کی کتابوں کے مولفین نے بھی اس حقیقت کا اعتراف کیا ہے بعنوان مثال مسلم بن حجاج نے اپنی کتاب صحیح میں جابر بن عبداللہ اور سلمہ بن اکوع سے روایت کی ہے کہ انہوں نے کہا:

خرج علینا منادي رسول اللہ ﷺ فقال: إن رسول اللہ قد أذن لکم أن تستمتعوا یعني متعۃ النساء.(۱(

پیغمبر اکرمؐ کے منادی نے ہمارے پاس آکر کہا کہ رسول خدا ﷺ نے تم لوگوں کو استمتاع کی اجازت دی ہے یعنی عورتوں سے متعہ کرنے کی اجازت دی ہے.

عقد متعہ سے متعلق صحاح اور مسانید میں جو روایات آئی ہیں ان سب کو اس کتاب میں بیان نہیں کیا جاسکتا البتہ ان سے یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ عالم اسلام کے تمام علماء اور مفسرین نے آغاز اسلام میں اور پیغمبر اکرم ﷺ کے زمانے میں عقد متعہ کے جائز ہونے کو تسلیم کیا ہے:(۲(

)۱(صحیح مسلم جز ۴ ص ۱۳۰ طبع مصر

)۲(نمونے کے طور پر ہم ان منابع میں سے بعض کا ذکر کرتے ہیں:

صحیح بخاری باب تمتع ۲

مسند احمد جلد ۴ ص ۴۳۶ اور جلد ۳ ص ۳۵۶

الموطا مالک جلد ۲ ص ۳۰.....

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا اس آیت کا حکم منسوخ ہوا ہے یا نہیں؟ شاید ہی کوئی ایسا آدمی ہو جو پیغمبر خداؐ کے زمانے میں متعہ کے شرعا جائز ہونے کے بارے میں تردید کرے بحث اس بارے میں ہے کہ یہ حکم آنحضرتؐ کے زمانے میں باقی تھا یا منسوخ ہو گیا تھا؟ تاریخ اسلام اور روایات کے مطابق خلیفہ دوم کے زمانے تک مسلمان اس حکم الہی پر عمل کرتے تھے اور سب سے پہلے خلیفہ دوم نے چند مصلحتوں کی بنا پر اس حکم پر عمل کرنے سے مسلمانوں کو روکا تھا. مسلم بن حجاج اپنی کتاب صحیح میں نقل کرتے ہیں کہ جب ابن عباس اور ابن زبیر کے درمیان متعۃ النساء اور متعہ حج کے سلسلے میں اختلاف ہو گیا تو جابر ابن عبداللہ نے کہا:

"فعلناھما مع رسول اللہ ﷺ ثم نھانا عنھما عمر فلم نعد لھما" (۱)

..... سنن بہیقی جلد ۷ ص ۳۰۶

تفسیر طبری جلد ۵ ص ۹

نہایہ ابن اثیر جلد ۳ ص ۲۴۹

تفسیر رازی جلد ۳ ص ۲۰۱

تاریخ ابن خلکان جلد ۱ ص ۳۵۹

احکام القرآن جصاص جلد ۲ ص ۱۷۸

محاضرات راغب جلد ۲ ص ۹۴

الجامع الکبیر سیوطی جلد ۸ ص ۲۹۳

فتح الباری ابن حجر جلد ۹ ص ۱۴۱

(۱) سنن بیہقی جلد ۷ ص ۲۰۶ اور صحیح مسلم جلد ۱ ص ۳۹۵

ہم رسول خدا ﷺ کے ہمراہ متعۃ النساء اور متعہ حج کو انجام دیتے تھے اور پھر عمر نے ہمیں ان دونوں کاموں سے روک دیا اس کے بعد سے ہم نے ان دونوں کو انجام نہیں دیا ہے .

جلال الدین سیوطی نے اپنی تفسیر میں عبدالرزاق اور ابوداؤد اور ابن جریر سے اور ان سب نے "حکم" سے روایت کی ہے کہ جب حکم سے آیۂ متعہ کے بارے میں سوال کیا گیا کہ کیا یہ آیت منسوخ ہوئی ہے؟ تو انہوں نے جواب دیا نہیں منسوخ نہیں ہوئی ہے اور حضرت علی۔ نے فرمایا ہے:

"لولا أن عمر نھیٰ عن المتعۃ ما زنیٰ إلا شقي" (۱)

اگر عمر نے متعہ سے منع نہ کیا ہوتا تو سوائے بدبخت کے کوئی زنا نہ کرتا.

نیز علی بن محمد قوشچی کہتے ہیں کہ عمر بن خطاب نے منبر پر بیٹھ کر کہا:

''أیّھاالناس ثلاث کنّ علی عھد رسول اللہ و أنا

أنھیٰ عنھنّ و أحرمھن و أُعاقب علیھنّ وھیمتعۃ

النساء ومتعۃ الحج وحیَّ علیٰ خیر العمل''(۲(

اے لوگو! تین چیزیں رسول خداؐ کے زمانہ میں تھیں لیکن میں ان سے منع کرتا ہوں اور انہیں حرام قرار دیتا ہوں اور جو کوئی بھی

)۱(تفسیر درالمنثور جلد ۲ ص ۱۴۰ سورہ نساء کی چوبیسویں آیت کی تفسیر کے ذیل میں.

)۲(شرح تجرید قوشچی بحث امامت ص ۴۸۴.

انہیں انجام دے گا، میں اسے سزا دوں گا وہ تین چیزیں یہ ہیں: متعۃ النساء اور متعۃ الحج اور حی علی خیر العمل.

عقد متعۃ کے جائز ہونے کے بارے میں اس قدر روایات ہیں کہ ان کو ذکر کرنا اس کتاب کی گنجائش سے باہر ہے. زیادہ معلومات کے لئے درج ذیل کتابوں کا مطالعہ فرمائیں(۱(

اب یہ مان لینا چاہیے کہ متعہ نکاح ہی کی ایک قسم ہے کیونکہ نکاح کی دو قسمیں ہیں: دائمی اور موقت اور وہ عورت جس کے ساتھ نکاح موقت کیا جائے وہ اس مرد کی

)۱(مسند احمد جلد ۳ ص ۳۵۶

البیان والتبیین جاحظ جلد ۲ صفحہ ۲۲۳

احکام القرآن جصاص جلد ۱ ص ۳۴۲

تفسیر قرطبیؒ جلد ۲ ص ۳۷۰

المبسوط سرخسی حنفی کتاب الحج باب القرآن

زاد المعاد ابن قیم جلد ۱ ص ۴۴۴

کنز العمال جلد ۸ ص ۲۹۳

مسند ابی داؤد طیالسی ص ۲۴۷

تاریخ طبری جلد ۵ ص ۳۲

المستبین طبری

تفسیر رازی جلد ۳ ص ۲۰۰ سے ۲۰۲ تک

تفسیر ابو حیان جلد ۳ ص ۲۱۸

زوجہ شمار ہوتی ہے اور وہ مرد بھی اس عورت کا شوہر کہلاتا ہے اس اعتبار سے فطری طور پر اس قسم کی شادی بھی نکاح سے متعلق آیتوں کے ذیل میں آئے گی مثال کے طور پر قرآن مجید کی یہ آیت ملاحظہ ہو:

)وَالذِّینَ ہُم لِفُرُوجِہِمْ حَافِظُونَ اِلاَّ عَلَی اَزْوَاجِہِمْ اَوْ مَا مَلَکَتْ اَیْمَانُہُم()۱(

اور مومنین اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرنیوالے ہیں علاوہ اپنی بیویوں اور اپنی ملکیت کی کنیزوں کے.

اب تمام گزشتہ شرائط کے ساتھ جس عورت سے متعہ کیا جائے وہ " اِلاَّ عَلَی اَزْوَاجِہِمْ "(سوائے اپنی بیویوں کے)کا ایک مصداق قرار پائے گی یعنی یہ عورت

اس مرد کی زوجہ کہلائے گی اور لفظ " اَزْوَاجِہِم "اس کو بھی اپنے اندر شامل کرے گا. سورہ مومنون کی یہ آیت جنسی عمل کو فقط دو قسم کی عورتوں یعنی بیویوں اور کنیزوں کے ساتھ جائز قرار دیتی ہے اور وہ عورت جس سے متعہ کیا گیا ہو وہ پہلی قسم کی عورتوں (یعنی اپنی بیویوں) میں شامل ہے.

یہاں پر بعض لوگوں کا یہ کلام تعجب خیز ہے کہ سورہ مومنون کی یہ آیت سورہ نساء کی چوبیسویں آیت کیلئے ناسخ ہے جب کہ ہم سب جانتے ہیں کہ ناسخ آیت کو منسوخ ہونے والی آیت کے بعد نازل ہونا چاہیے اور یہاں معاملہ بالکل برعکس ہے سورہ مومنون جسکی

)۱(سورہ مومنون آیت: ۵اور ۶

آیت کو ناسخ تصور کیا جارہا ہے وہ مکی ہے (یعنی یہ سورہ آنحضرتؐ کی ہجرت سے قبل مکہ معظمہ میں نازل ہوا ہے) اور سورہ نساء جس میں آیۂ متعہ ہے مدنی ہے (یعنی یہ سورہ مدینۂ منورہ میں آنحضرتؐ کی ہجرت کے بعد نازل ہوا ہے) اب سوال یہ ہے کہ مکی سورہ میں آنے والی آیت مدنی سورہ میں آنے والی آیت کیلئے کیسے ناسخ بن سکتی ہے؟

اسی طرح رسول خداؐ کے زمانے میں آیہ متعہ کے منسوخ نہ ہونے کی ایک اور واضح دلیل وہ کثیر روایات ہیں جن کے مطابق یہ آیت آنحضرتؐ کے زمانے میں منسوخ نہیں ہوئی تھی ایسی روایتوں میں سے ایک روایت تو وہی ہے جسے جلال الدین سیوطی نے اپنی تفسیر درالمنثور میں ذکر کیا ہے اور جس کی وضاحت گزشتہ صفحات میں گزر چکی ہے)۱(

آخر میں ہم اس نکتے کا ذکر کر دیں کہ وہ ائمہ معصومین ۲۲۲ جو حدیث ثقلین کے مطابق امت کے ہادی اور قرآن کے ہم پلہ ہیں انہوں نے عقد متعہ کے شرعاً جائز

ہونے اور اس کے منسوخ نہ کئے جانے کو بڑی صراحت کے ساتھ بیان کیا ہے. (۲(

ساتھ ہی ساتھ اسلام چونکہ ہر زمانے میں انسانوں کی مشکلات کو حل کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے لہذا اس نے بھی چند ذکر شدہ شرائط کی رعایت کے ساتھ اس قسم کے نکاح کو جائز قرار دیا ہے کیونکہ آج کی اس گمراہ کن دنیا میں جوانوں کو تباہی کے دلدل سے نجات دینے کے لئے ایک ہی راستہ ہے اور وہ ہے متعہ۔

)۱ (تفسیر درالمنثور جلد ۲ ص ۱۴۰ اور ص ۱۴۱ سورہ نساء کی چوبیسویں آیت کی تفسیر کے ذیل میں.

)۲(وسائل الشیعہ جلد ۱۴ کتاب ا لنکاح ابواب متعہ باب اول ص ۴۳۶.

انیسواں سوال

شیعہ خاک پر کیوں سجدہ کرتے ہیں؟

جواب: بعض لوگ یہ تصور کرتے ہیں کہ خاک یا شہیدوں کی تربت پر سجدہ کرنا ان کی عبادت کرنے کے برابر ہے اور یہ ایک قسم کا شرک ہے. اس سوال کے جواب میں اس بات کی طرف توجہ دلانا ضروری ہے کہ ان دو جملوں ''السجود للہ'' و''السجود علی الأرض'' میں بڑا فرق ہے اور اس سوال سے

ظاہر ہوتا ہے کہ سوال کرنے والا ان دو جملوں کے درمیان موجود فرق کو نہیں سمجھ پایا ہے ۔

السجود للہ کے معنی یہ ہیں کہ سجدہ خدا کے لئے ہوتا ہے اور السجود علیٰ الأرض یعنی سجدہ زمین پر ہوتا ہے۔ بہ الفاظ دیگر ہم زمین پر خدائے عظیم کا سجدہ بجالاتے ہیں اصولی طور پر دنیا کے سارے مسلمان کسی نہ کسی چیز کے اوپر سجدہ کرتے ہیں جبکہ وہ خدا کا سجدہ کرتے ہیں مسجد الحرام میں بھی لوگ پتھروں پر سجدہ کرتے ہیں جبکہ ان کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ خدا کا سجدہ کر رہے ہیں۔

اس بیان کے ساتھ یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ خاک یا پتوں یا کسی اور چیز پر سجدہ کرنا ان چیزوں کی عبادت نہیں ہے بلکہ اس کے ذریعہ خدائے عظیم کے سامنے خود کو خاک سمجھتے ہوئے اس کے لئے سجدہ کرنا مقصود ہوتا ہے اور اسی طرح یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ خاک شفا پر سجدہ کرنا خاک شفا کو سجدہ کرنا نہیں ہے۔ قرآن مجید فرماتا ہے:

)وَلِلّٰہِ یَسْجُدُ مَنْ فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْض)(۱(

اللہ ہی کو زمین و آسمان میں رہنے والے سب سجدہ کرتے ہیں۔

نیز پیغمبر اسلامؐ فرماتے ہیں:

''جُعِلَتْ لِي الأَرض مسجداً و طھوراً'' (۲(

زمین میرے لئے جائے سجدہ اور پاک کرنے والی قرار دی گئی ہے۔

لہذا ''خدا کے لئے سجدہ'' اور ''زمین یا خاک شفا پر سجدہ'' کے درمیان آپس میں پوری طرح سازگاری ہے کیونکہ خاک اور پتوں پر سجدہ کرنا خدائے عظیم کے سامنے انتہائی درجہ کے خضوع کی علامت ہے۔ اس بارے میں شیعوں کے نظریئے کی وضاحت کے لئے بہتر یہ ہے کہ ہم امام صادقؑ کے اس گہربار ارشاد کو پیش کریں:

''عن ھشام ابن الحکم قال قلت لأبي عبد اللہ۔ اخبرني عما یجوز السجود علیہ و عما لا یجوز

)۱(سورہ رعد آیت: ۱۵

)۲(صحیح بخاری کتاب الصلوۃ ص ۹۱

علیہ؟ قال: السجود لا یجوز إلاّ علی الأرض أو ما أنبتت إلاّ الأرض الا ما أکل أو لبس فقلت لہ: جعلت فداک ما العلّۃ في ذلک؟ قال: لأن السجود ھو الخضوع للہ عزّ و جلّ فلا ینبغي أن یکون علیٰ ما یؤکل و یلبس لأن أبناء الدنیا عبید ما یأکلون و یلبسون والساجد في سجودہ في عبادۃ اللہ عزّ و جلّ فلا ینبغي أن یضع جبھتہ في سجودہ علیٰ معبود أبناء الدنیا الذین اغتروا بغرورھا والسجود علیٰ الأرض أفضل لأنہ أبلغ في التواضع والخضوع للہ عزّ و جلّ''(۱(

ہشام بن حکم کہتے ہیں کہ میں نے امام صادقؑ کی خدمت میں عرض کیا کہ آپ رہنمائی فرمائیں کہ کن چیزوں پر سجدہ کرنا صحیح ہے اور کن چیزوں پر صحیح نہیں ہے؟ امامؑ نے فرمایا سجدہ صرف زمین اور اس سے اگنے والی اشیاء پر ہو سکتا ہے لیکن کھانے اور پہننے والی اشیاء پر سجدہ نہیں کیا جا سکتا میں نے عرض کی: میں آپ پر قربان ہو جاؤں اس کا کیا سبب ہے؟ امامؑ نے فرمایا: سجدہ خداوند عزوجل کے لئے خضوع کا نام ہے پس یہ صحیح نہیں ہے کہ

)۱(بحارالانوار جلد ۸۵ ص ۱۴۷ ''علل الشرائع'' سے نقل کرتے ہوئے.

کھانے اور پہننے والی چیزوں پر سجدہ کیا جائے کیونکہ دنیاپرست افراد خوراک اور لباس کے بندے ہیں جبکہ انسان سجدے کی حالت میں اللہ عزوجل کی عبادت میں مشغول ہوتا ہے. پس یہ مناسب نہیں ہے کہ اپنی پیشانی اس چیز پر رکھے جس کو دنیاپرست اپنا معبود سمجھتے ہیں اور وہ دنیا کے دھوکہ میں آگئے ہیں اور زمین پر سجدہ کرنا افضل ہے کیونکہ اس سے خدا کی بارگاہ میں زیادہ خضوع کا اظہار ہوتا ہے.

امام کا یہ کلام اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ خاک پر سجدہ اس وجہ سے کیا جاتا ہے کہ یہ کام خدا کی بارگاہ میں تواضع کو ظاہر کرنے کا سب سے اچھا طریقہ ہے.

۶۶۶

یہاں پر ایک اور سوال بھی سامنے آتا ہے کہ شیعہ صرف خاک اور بعض پتوں ہی پر کیوں سجدہ کرتے ہیں اور باقی چیزوں پر سجدہ کیوں نہیں کرتے؟

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ جس طرح یہ ضروری ہے کہ ہر عبادت کا حکم شریعت کی طرف سے ہم تک پہنچے اسی طرح یہ بھی ضروری ہے کہ اس کے تمام شرائط، اجزاء، اور اس کا طریقہ بھی شریعت کو بیان کرنے والی شخصیت یعنی پیغمبر اکرم ﷺ کے اقوال اور کردار کے ذریعے ہم تک پہنچے کیونکہ قرآن کے حکم کے مطابق تمام مسلمانوں کے لئے اسوہ اور نمونہ عمل فقط پیغمبر گرامیؐ کی ذات ہے.

اب ہم چند ایسی احادیث ذکر کرتے ہیں جو اس بارے میں پیغمبر اسلامؐ کی سیرت کو بیان کرتی ہیں یہ حدیثیں اس بات کو بیان کرتی ہیں کہ آنحضرتؐ خاک پر اور زمین سے اگنے والی بعض چیزوں جیسے چٹائی وغیرہ پر سجدہ فرماتے تھے اور آج شیعہ بھی اسی چیز کا عقیدہ رکھتے ہیں بہت سے مسلمان محدثین نے اپنی صحاح و مسانید میں آنحضرتؐ سے نقل کیا ہے کہ آپؐ نے زمین کو اپنے لئے سجدہ کے عنوان سے پہچنوایا تھا آنحضرتؐ فرماتے ہیں:

''جعلت لي الأرض مسجداً و طهوراً''(۱(

زمین میرے لئے جائے سجدہ اور پاک کرنے والی قرار دی گئی ہے.

۱(اس حدیث میں لفظ ''جعلت'' قانون گزاری کے معنی میں ہے اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ یہ مسئلہ دین اسلام کی پیروی کرنے والوں کے لئے ایک حکم الٰہی ہے اس حدیث سے خاک، پتھر اور ہر اس چیز پر سجدے کا جائز ہونا ثابت ہوتا ہے کہ جس کو زمین کہا جاسکے.

۲(بعض دوسری روایات اس نکتے پر دلالت کرتی ہیں کہ پیغمبر اسلامؐ نے مسلمانوں کو حکم دیا ہے کہ سجدہ کرتے وقت اپنی پیشانیوں کو خاک پر رکھا کریں جیسا کہ

)۱(سنن بیہقی جلد ۱ ص ۲۱۲ (باب التیمم بالصعید الطیب) صحیح بخاری جلد ۱ کتاب الصلوۃ ص ۱۹۱ اقتضاء الصراط المستقیم (ابن تیمیہ) ص ۳۳۲.

زوجہ پیغمبرؐام سلمہ آنحضرتؐ سے روایت کرتی ہیں کہ آپ نے فرمایا:

''ترّب وجھک للہ''(۱(

اللہ کے لئے اپنے چہرے کو خاک پر رکھو.

اس حدیث میں ''ترب'' کے لفظ سے دو نکتے سمجھ میں آتے ہیں ایک یہ ہے کہ انسان کو سجدہ کرتے وقت اپنی پیشانی کو خاک پر رکھنا چاہیے دوسرا نکتہ یہ ہے کہ ''ترب'' صیغہ امر ہے لہذا خاک پر سجدہ کرنا واجب ہے.

۳(خود آنحضرتؐ کا عمل بھی خاک پر سجدے کے صحیح ہونے کا بہترین گواہ ہے وائل بن حجر کہتے ہیں:

''رأیت النبي ﷺ اِذا سجد وضع جبھتہ وأنفہ علیٰ الأرض''(۲(

میں نے پیغمبر ﷺ کو دیکھا ہے کہ جب آپ سجدہ کرتے تھے تو اپنی پیشانی اور ناک کو زمین پر رکھتے تھے.

انس بن مالک اور ابن عباس اور آپؐ کی ازواج جیسے عائشہ اور ام سلمہ اور بہت سے محدثین نے اس طرح روایت کی ہے:

''کان رسول اللہ ﷺ یصلي علیٰ الخمرۃ''(۳(

)۱(کنز العمال جلد ۷ ص ۴۶۵ حدیث نمبر ۱۹۸۰۹ کتاب الصلوۃ السجود وما یتعلق بہ.

)۲ (احکام القرآن (جصاص حنفی جلد ۳ ص ۲۰۹ باب السجود علی الوجہ(

)۳(سنن بیہقی جلد ۲ ص ۴۲۱ کتاب الصلوۃ علی الخمرہ.

رسول خدا ﷺ چٹائی پر نماز پڑھتے تھے (ایسی چٹائی جو کہ کھجور کی پتیوں سے تیار کی جاتی تھی (

پیغمبر اکرمؐ کے صحابی ابو سعید کہتے ہیں کہ:

''دخلت علیٰ رسول اللہ ﷺ وھو یصلي علیٰ حصیر''(۱(

میں رسول خداؐ کی خدمت میں حاضر ہوا تو اس وقت آپ چٹائی پر نماز پڑھ رہے تھے.

یہ بات شیعوں کے نظریئے کے صحیح ہونے کی گواہی دیتی ہے کیونکہ وہ بھی یہی کہتے ہیں کہ زمین سے اگنے والی ان اشیاء پر سجدہ صحیح ہے جو نہ تو کھائی جاتی ہوں اور نہ ہی پہنی جاتی ہوں.

۴(پیغمبر اسلامؐ کے اصحاب اور تابعین کی سیرت اور ان کے اقوال بھی اس بارے میں آنحضرت کی سنت کو بیان کرتے ہیں: جابر بن عبداللہ انصاری کہتے ہیں:

''کنت أصلي الظھر مع رسول اللہ ﷺ فأخذ قبضۃ من الحصاء لتبرد في کفي أضعھا لجبھتي أسجد علیھا لشدۃ الحرّ''(۲(

)۱(گذشتہ حوالہ.

)۲ (سنن بیہقی جلد ۱ ص ۴۳۹ کتاب الصلوۃ باب ماروی فی التعجیل بھا فی شدۃ الحر.

جب میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ نماز ظہر پڑھتا تھا تو اپنی مٹھی میں سنگ ریزے اٹھالیتا تھا تاکہ وہ میرے ہاتھ میں ٹھنڈے ہو جائیں اور انہیں سجدہ کے وقت اپنی پیشانی کے نیچے رکھ سکوں کیونکہ گرمی بہت شدید تھی.

اور پھر خود راوی نے اس بات کا اضافہ کیا ہے کہ اگر اپنے کپڑوں پر سجدہ کرنا جائز ہوتا تو یہ سنگریزوں کے اٹھانے اور انہیں سنبھالنے سے آسان تھا.

ابن سعد (وفات ۲۰۹ ھ) اپنی کتاب ''الطبقات الکبری'' میں یوں لکھتے ہیں:

''کان مسروق اذا خرج یخرج بلبنۃ یسجد علیھا فی السفینۃ''(۱(

مسروق ابن اجدع جس وقت سفر کے لئے نکلتے تھے تو اپنے ساتھ ایک کچی اینٹ رکھ لیتے تھے تاکہ کشتی میں اس پر سجدہ کر سکیں.

مسروق بن اجدع پیغمبرؐ کے تابعین اور ابن مسعود کے اصحاب میں سے تھے،

کتاب ''الطبقات الکبری'' کے مؤلف ان کے بارے میں تحریر کرتے ہیں:

''وہ پیغمبر اکرمؐ کے بعد اہل کوفہ میں سے طبقہ اول کے لوگوں میں سے تھے اور انہوں نے ابو بکر، عمر، عثمان، علیؑ اور عبداللہ بن مسعود سے روایتیں نقل کی ہیں''.

اس کلام سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مٹی کی سجدہ گاہ کا ہمراہ رکھنا ہر گز شرک یا

)۱''(الطبقات الکبری''، جلد ۶ ص ۷۹ طبع بیروت مسروق بن اجدع کے حالات کو بیان کرتے ہوئے.

بدعت نہیں ہے کیونکہ صحابۂ کرام بھی ایسا کرتے تھے.(۱(

نافع کہتے ہیں:

''ان ابن عمر کان اذا سجد وعلیہ العمامۃ یرفعھا حتی یضع جبھتہ بالأرض''(۲(

عبداللہ بن عمر سجدہ کرتے وقت اپنے عمامے کو اوپر کر لیا کرتے تھے تاکہ اپنی پیشانی کو زمین پر رکھ سکیں.

رزین کہتے ہیں:

''کتب إليّ عليّ بن عبداللہ بن عباس ۲۳۹ أن أبعث إليّ بلوح من أحجار المروۃ أسجد علیھا''(۳(

علی بن عبداللہ بن عباس ۲۳۹ نے مجھے لکھا کہ مروہ پہاڑ کے ایک پتھر کی تختی میرے پاس بھیج دو تاکہ میں اس پر سجدہ کر سکوں.

۵(دوسری طرف سے مسلمان محدثین نے کچھ روایتیں نقل کی ہیں جن کے مطابق پیغمبر اسلام ﷺ نے ایسے افراد کو ٹوکا ہے جو سجدہ کرتے وقت اپنی پیشانی اور زمین کے درمیان عمامے کے کپڑے کو حائل کر لیا کرتے تھے.

)۱(اس سلسلے میں مزید شواہد کے لئے علامہ امینیؒ کی کتاب ''سیر تنا'' کی طرف مراجعہ فرمائیں.

)۲(سنن بیہقی جلد ۲ ص ۱۰۵(مطبوعہ حیدر آباد دکن) کتاب الصلوۃ باب الکشف عن السجدۃ فی السجود

)۳(ازرقی، اخبار مکہ جلد ۳ ص ۱۵۱

صالح سبائی کہتے ہیں:

''اِنّ رسول اللہ ﷺ رأی رجلاً یسجد علیٰ جنبہ وقد اعتم علیٰ جبھتہ فحسر رسول اللہ ﷺ علیٰ جبھتہ''(۱(

رسول خدا ﷺ نے اپنے پاس ایک ایسے شخص کو سجدہ کرتے دیکھا جس نے اپنی پیشانی پر عمامہ باندھ رکھا تھا تو آنحضرتؐ نے اس کے عمامے کو ہٹا دیا.

عیاض بن عبداللہ قرشی کہتے ہیں:

''رأی رسول اللہ ﷺ رجلاً یسجد علیٰ کور عمامتہ فأومٔ أبیدہ ارفع عمامتک وأومأ الیٰ جبھتہ''(۲(

رسول خدا ﷺ نے ایک شخص کو دیکھا جو اپنے عمامے کے ایک گوشے پر سجدہ کر رہا تھا تو آپ نے اس کی طرف ہاتھ اٹھا کر پیشانی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا اپنے عمامے کو اوپر اٹھاؤ.

ان روایات سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ رسول خداؐ کے زمانے میں زمین پر

)۱(سنن بیہقی جلد ۲ ص ۱۰۵

)۲(گذشتہ حوالہ.

سجدہ کرنا ایک لازمی امر تھا اور جب بھی کوئی شخص عمامے پر سجدہ کرتا تو آنحضرتؐ اسے اس کام سے روکتے تھے.

۶(شیعوں کے ائمہ اطہار ۲۲۲ جو کہ حدیث ثقلین کے مطابق، قرآن مجید سے کبھی جدا نہ ہوں گے اور دوسری طرف وہ پیغمبر اکرمؐ کے اہل بیت ہیں انہوں نے زمین پر سجدہ کو صراحت کے ساتھ بیان کیا ہے امام صادق۔ فرماتے ہیں:

''السجود علیٰ الأرض فریضۃ وعلیٰ الخمرۃ سنۃ''(۱(

زمین پر سجدہ کرنا حکم الٰہی ہے اور چٹائی پر سجدہ سنت پیغمبر ﷺ ہے.

اور ایک مقام پر فرماتے ہیں:

''السجود لا یجوز الا علیٰ الأرض أو علیٰ ما أنبتت الأرض الا ما أکل أو لبس''(۲(

سجدہ کرنا صحیح نہیں ہے سوائے زمین یا اس سے اگنے والی اشیاء پر لیکن کھائی اور پہننے والی اشیاء پر سجدہ نہیں ہو سکتا.

نتیجہ: گزشتہ دلائل کی روشنی میں یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ نہ صرف اہل بیت ۲۲۲ کی روایات بلکہ رسول خداؐ کی سنت اور آنحضرتؐ کے اصحاب اور تابعین کی سیرت اس

)۱(وسائل الشیعہ جلد ۳ ص ۵۹۳ کتاب الصلوۃ ابواب مایسجد علیہ، حدیث نمبر ۷.

)۲(وسائل الشیعہ جلد ۳ ص ۵۹۱ کتاب الصلوۃ ابواب مایسجد علیہ، حدیث نمبر ۱.

بات کی گواہ ہیں کہ سجدہ صرف زمین یا اس سے اگنے والی اشیاء (سوائے کھانے اور پہنے جانے والی اشیاء کے) پر ہی کیا جا سکتا ہے اس کے علاوہ بقیہ دوسری چیزوں پر سجدے کے جائز ہونے کے سلسلے میں اختلاف پایا جاتا ہے لہذا اس احتیاط پر عمل کرتے ہوئے نجات اور کامیابی کی راہ صرف یہ ہے کہ ان چیزوں

پر سجدہ کیا جائے

جن پر سب کا اتفاق ہے آخر میں ہم اس نکتے کی یاد آوری ضروری سمجھتے ہیں کہ یہ بحث صرف ایک فقہی مسئلہ ہے اور اس قسم کے جزئی مسائل کے بارے میں مسلمان فقہاء کے درمیان بہت اختلافات ہیں لیکن اس قسم کے اختلافات کو کسی قسم کی پریشانی کا باعث نہیں بننا چاہیے کیونکہ اس قسم کے فقہی اختلافات اہل سنت کے چار فرقوں کے درمیان فراوان ہیں مثال کے طور پر مالکی کہتے ہیں کہ ناک کو سجدہ گاہ پر رکھنا مستحب ہے جب کہ حنبلی کہتے ہیں کہ یہ عمل واجب ہے اور اسے چھوڑنے کی صورت میں سجدہ باطل ہو جائے گا۔(۱(

)۱ (الفقہ علی المذاہب الاربعۃ جلد ا ص ۱۶۱ طبع مصر کتاب الصلوۃ، بحث سجود.

بیسواں سوال

شیعہ حضرات زیارت کرتے وقت حرم کے دروازوں اور دیواروں کو کیوں چومتے ہیں اور انہیں باعث برکت کیوں سمجھتے ہیں؟

جواب: اولیائے الٰہی سے منسوب اشیاء کو اپنے لئے باعث برکت سمجھنا کوئی ایسا جدید مسئلہ نہیں ہے جو مسلمانوں کے درمیان آج پیدا ہوا ہو بلکہ اس کی بنیادیں رسول خداؐ اور ان کے صحابہ کے زمانے میں دکھائی دیتی ہیں. اس عمل کو نبی اکرمؐ اور ان کے اصحاب ہی نے انجام نہیں دیا ہے بلکہ گزشتہ انبیاء ۲۲۲

بھی ایسا ہی کرتے تھے اب ہم آپ کے سامنے اس عمل کے جائز ہونے کے سلسلے میں قرآن مجید اور سنت پیغمبرؐ سے چند دلیلیں پیش کرتے ہیں:

۱۔ قرآن مجید میں ہم پڑھتے ہیں کہ جس وقت حضرت یوسف۔ نے اپنے بھائیوں کے سامنے خود کو پہچنوایا اور ان کے گناہوں کو معاف کر دیا تو یہ فرمایا:

)اِذْهَبُوا بِقَمِيصِي هٰذَا فَأَلْقُوهُ عَلٰى وَجْهِ أَبِي يَأْتِ بَصِيرًا)(۱(

میری یہ قمیص لے کر جاؤ اور میرے بابا کے چہرے پر ڈال دو کہ انکی بصارت پلٹ آئے گی.

اور پھر قرآن فرماتا ہے:

)فَلَمَّا أَنْ جَاءَ الْبَشِيرُ أَلْقَاهُ عَلٰى وَجْهِهِ فَارْتَدَّ بَصِيرًا)(۲(

اور اس کے بعد جب بشارت دینے والے نے آکر قمیص کو یعقوب کے چہرے پر ڈال دیا تو وہ دوبارہ صاحب بصارت ہو گئے.

قرآن مجید کی یہ آیتیں گواہی دے رہی ہیں کہ ایک نبی (جناب یعقوب۔) نے دوسرے نبی (جناب یوسف۔) کی قمیص کو باعث برکت سمجھا تھا اور یہی نہیں بلکہ حضرت یعقوب۔ کا یہ عمل ان کی بصارت کے لوٹنے کا سبب بنا تھا. کیا یہاں پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان دو انبیاء کے اس عمل نے انہیں توحید اور عبادت خدا کے دائرے سے خارج کر دیا تھا!؟

۲۔ اس بات میں کوئی شک نہیں ہے کہ رسول خداؐ خانہ کعبہ کا طواف کرتے وقت

)۱(سورہ یوسف آیت: ۹۳

)۲(سورہ یوسف آیت: ۹۶

انہوں نے جواب دیا:

"رایت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یستلمہ ویقبلہ"(۱(

میں نے رسول خداؐ کو دیکھا ہے کہ وہ حجر اسود کو سلام کر رہے تھے اور بوسے دے رہے تھے.

اگر ایک پتھر کو سلام کرنا اور بوسے دینا شرک ہوتا تو نبی اکرمؐ ہرگز اس عمل کو انجام نہ دیتے.

۳۔ صحیح، مسند اور تاریخی کتابوں میں بہت سی ایسی روایات ہیں جن کے مطابق صحابۂ کرام آنحضرتؐ سے منسوب اشیاء جیسے آپؐ کا لباس، آپ کے وضو کا پانی اور برتن وغیرہ کو باعث برکت سمجھتے تھے اگر ان روایات کا مطالعہ کیا جائے تو اس عمل کے جائز ہونے میں کسی بھی قسم کی تردید باقی نہیں رہے گی.

اگرچہ اس بارے میں وارد ہونے والی روایات کی تعداد زیادہ ہے اور سب کو اس مختصر کتاب میں پیش کرنا ممکن نہیں ہے لیکن پھر بھی یہاں ہم ان میں سے بعض روایتوں کو نمونہ کے طور پر پیش کر رہے ہیں:

الف: بخاری نے اپنی کتاب صحیح میں آنحضرتؐ اور ان کے اصحاب کے خصوصیات کو بیان کرنے والی ایک طولانی روایت کے ضمن میں یوں نقل کیا ہے:

"واذا توضّأ کادوا یقتتلون علیٰ وضوئہ"(۲(

)۱(صحیح بخاری جزء ۲ کتاب الحج باب تقبیل الحجر ص ۱۵۱ اور ص ۱۵۲ طبع مصر.

)۲(صحیح بخاری جلد ۳ باب مایجوز من الشروط في الاسلام باب الشروط في الجہاد والمصالحۃ ص ۱۹۵

جس وقت پیغمبر خداؐ وضو کرتے تھے تو نزدیک ہوتا تھا کہ مسلمان آپؐ کے وضو کے پانی کو حاصل کرنے کے لئے آپس میں جنگ شروع کر دیں.

ب: ابن حجر کہتے ہیں کہ :

"اِنّ النبي ﷺ كان يؤتي بالصبيان فيبرک عليهم"(۱(

بے شک نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں بچوں کو لایا جاتا تھا اور آنحضرتؐ اپنے وجود کی برکت سے انہیں بھی بابرکت بنا دیتے تھے.

ج: محمد طاہر مکی کہتے ہیں: ام ثابت سے روایت ہوئی ہے وہ کہتی ہیں: کہ رسول خداؐ میرے ہاں تشریف لائے اور آپ نے دیوار پر آویزاں ایک مشک کے دھانے سے کھڑے ہو کر پانی نوش فرمایا یہ دیکھ کر میں اپنی جگہ سے اٹھی اور میں نے اس مشک کے دھانے کو کاٹ کر اپنے پاس رکھ لیا اور پھر اضافہ کرتے ہوئے کہتے ہیں: اسی حدیث کو ترمذی نے نقل کرتے ہوئے کہا ہے کہ یہ حدیث صحیح اور حسن ہے اور کتاب ریاض الصالحین میں اس حدیث کی شرح میں کہا گیا ہے کہ ام ثابت نے مشک کے دھانے کو اس لئے کاٹ لیا تھا تا کہ وہ اس جگہ کو اپنے پاس محفوظ کر لیں جہاں سے پیغمبر اکرمؐ نے پانی نوش فرمایا تھا کیونکہ وہ اسے باعث برکت سمجھتی تھیں اسی طرح صحابہ کی بھی یہی کوشش رہتی تھی کہ وہ اس جگہ سے پانی پئیں جہاں سے پیغمبر اکرمؐ نے پانی پیا ہو.(۲(

)۱(الاصابۃ جلد ا خطبہ کتاب ص ۷ طبع مصر

)۲(تبرک الصحابہ (محمد طاہر مکی) فصل اول ص ۲۹ ترجمہ انصاری.

"كان رسول الله ﷺ إذا صلى الغداة جاء خدم المدينة بآنيتهم فيها الماء فما يُؤتى بإناءٍ إلا غمس يده فيها فربما جاؤوه في الغداة الباردة فيغمس يده فيها"(۱(

رسول خداؐ جب نماز صبح سے فارغ ہو جاتے تو مدینہ کے خادم پانی کے برتن لئے آنحضرتؐ کی خدمت میں آتے تھے اور آپؐ ان سب برتنوں میں اپنا ہاتھ ڈبو دیتے تھے بعض اوقات تو وہ لوگ ٹھنڈک والی صبح میں آنحضرتؐ کی خدمت میں پہنچ جاتے تھے لیکن پھر بھی آنحضرتؐ ان کے برتنوں میں ہاتھ ڈبو دیتے تھے. (۲(

گذشتہ دلائل کی روشنی میں یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اولیائے الٰہی سے منسوب اشیاء کو باعث برکت قرار دینا ایک جائز عمل ہے اور وہ لوگ جو شیعوں پر اس عمل کی وجہ سے تہمت لگاتے ہیں وہ توحید اور شرک کے معنی کو اچھی طرح سے سمجھ نہیں پائے ہیں کیونکہ شرک کے معنی یہ ہیں کہ خدا کی عبادت کے ساتھ کسی دوسرے کو بھی خدا سمجھا جائے یا یہ عقیدہ ہو کہ خدائی امور اس کے سپرد کر دیئے گئے ہیں اور وہ اپنے وجود اور

)۱(صحیح مسلم جزء ۷ کتاب الفضائل باب قرب النبیؐ من الناس و تبرکھم بہ، ص ۷۹.

)۲(مزید معلومات کے لئے درج ذیل کتابوں کا مطالعہ فرمائیں:

صحیح بخاری، کتاب اشربہ، مؤطا مالک جلد ا ص ۱۳۸ باب صلوۃ علی النبیؐ، اسد الغابۃ جلد ۵ ص ۹۰، مسند احمد جلد ۴ ص ۳۲، الاستیعاب (الاصابۃ) کے حاشیے میں جلد ۳ ص ۶۳۱، فتح الباری جلد ا صفحہ ۲۸۱ اور ۲۸۲.

تاثیر رکھنے میں خدا سے بے نیاز ہے .

جبکہ شیعہ اولیائے الٰہی اوران سے متعلق اشیاء کو خدا کی مخلوق اور اس کا محتاج سمجھتے ہیں اور وہ اپنے اماموں اور دین کے پرچمداروں کے احترام اور ان سے سچی محبت کے اظہار کے لئے ان بزرگوں کو باعث برکت قرار دے کر ان سے فیض حاصل کرتے ہیں.

شیعوں کا پیغمبر اسلامؐ اور ان کے اہل بیت ۲۲۲ کے حرم میں جا کر ان کی ضریح مقدس کو بوسہ دینا یا حرم کے در و دیوار کو مس کرنا صرف اس وجہ سے ہے کہ ان کے دل پیغمبر خداؐ اور ان کی عترتؑ کے عشق سے سرشار ہیں اور یہ عشق ہر انسان کی فطرت میں پایا جاتا ہے اور یہ ایک انسانی محبت کا جذبہ ہے جو ہر محبتی انسان کے اندر ظاہر ہوتا ہے: اس بارے میں ایک شاعر کہتا ہے:

أمر علی الدیار دیار سلمیٰ اقبل ذاالجدار وذالجدارا

وماحُبّ الدیار شغفن قلبي ولکن حُبّ مَن سکن الدیارا

میں جب سلمیٰ کے دیار سے گزرتا ہوں تو اس دیوار اور اس دیوار کے بوسے لیتا ہوں اس دیار کی محبت نے میرے دل کو لبھایا نہیں ہے بلکہ اس دیار کے ساکن کی محبت نے میرے قلب کو اسیر کر لیا ہے۔

اکیسواں سوال

کیا اسلام کی نگاہ میں دین سیاست سے جدا نہیں ہے؟

جواب: اس سوال کے جواب سے قبل بہتر یہ ہے کہ پہلے سیاست کے معنی کو واضح کر دیا جائے تا کہ دین اور سیاست کا رابطہ سمجھ میں آسکے یہاں سیاست کے دو معنی بیان کئے جاتے ہیں.

۱۔ سیاست کے یہ معنی مراد لئے جائیں کہ اپنے ہدف تک پہنچنے کے لئے ہر قسم کے وسیلے کو اختیار کیا جائے چاہے وہ وسیلہ دھوکہ اور فریب کاری ہی کیوں نہ ہو (یعنی مقصد کے حصول کے لئے کسی بھی چیز کو وسیلہ بنایا جاسکتا ہے) واضح ہے کہ اس قسم کی سیاست دھوکے اور فریب سے بڑھ کر کچھ نہیں ہے اور ایسی سیاست کا دین سے کوئی تعلق نہیں ہے.

۲۔ سیاست کے یہ معنی مراد لئے جائیں کہ اسلامی اصولوں کے مطابق انسانی معاشرے کے نظام کو چلایا جائے اس قسم کی سیاست کے معنی یہ ہیں کہ مسلمانوں کے نظام کو قرآن اور سنت کی روشنی میں چلایا جائے ایسی سیاست دین کا حصہ ہے اور ہر گز اس سے جدا نہیں ہے.

اب ہم یہاں پر سیاست اور دین کے درمیان رابطے اور حکومت کو تشکیل دینے سے متعلق چند دلیلیں پیش کریں گے: اس سلسلے میں واضح ترین گواہ پیغمبر خداؐ کا عمل ہے پیغمبر خداؐ کے اقوال اور کردار کے مطالعے سے یہ بات اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ آنحضرتؐ نے اپنی دعوت اسلام کے آغاز ہی سے ایک ایسی مضبوط حکومت قائم کرنے کا ارادہ کر لیا تھا جس کی بنیاد خدا پر ایمان کے محکم عقیدہ پر استوار تھی اور جو اسلام کے مقاصد کو پورا کر سکتی تھی یہاں پر بہتر ہے کہ ہم رسول خداؐ کے اس عزم وارادہ کے سلسلے میں چند شواہد پیش کریں:

پیغمبر خداؐ اسلامی حکومت کے بانی ہیں

ا۔ جس وقت رسول خداﷺ کو حکم ملا کہ لوگوں کو کھلم کھلا طریقے سے اسلام کی دعوت دیں تو اس وقت آنحضرتؐ نے مختلف طریقوں سے جہاد و ہدایت کے زمینے کو ہموار کیا اور اسلامی سپاہیوں کی تربیت اور ان کی آمادگی کا بیڑا اٹھایا اس سلسلے میں آپ نزدیک اور دور سے زیارت کعبہ کے لئے آنے والے افراد سے ملاقات کرتے تھے اور انہیں اسلام کی طرف دعوت دیتے تھے اسی دوران آپؐ نے مدینے کے دو گروہوں سے عقبہ کے مقام پر ملاقات کی اور ان سے یہ معاہدہ کیا کہ وہ لوگ آنحضرتؐ کو اپنے شہر میں بلائیں گے اور آپؐ کی حمایت کریں(ا) اور اس طرح اسلامی حکومت قائم

)ا (سیرہ ہشام جلد ا ص ۴۳۱ مبحث عقبہ اولی طبع دوم مصر

کرنے کے لئے آنحضرتؐ کی سیاست کا آغاز ہوا.

۲۔ رسول خداؐ نے مدینہ ہجرت کرنے کے بعد ایک ایسی مضبوط فوج تیار کی جس نے بیاسی جنگیں لڑیں اور ان جنگوں میں کامیابی حاصل کر کے اسلامی حکومت کی راہ میں آنے والی تمام رکاوٹوں کو ہٹا دیا.

۳۔ مدینے میں اسلامی حکومت قائم ہونے کے بعد آنحضرتؐ نے اس زمانے کی سیاسی اور اجتماعی بڑی طاقتوں کے پاس اپنے سفیر اور خطوط بھیج کر ان سے رابطہ قائم کیا اور بہت سے قبیلوں کے سربراہوں سے اقتصادی، سیاسی اور فوجی معاہدے کئے تاریخ نے پیغمبر خداؐ کے ان خطوط کی خصوصیات و تفصیلات کو بیان کیا ہے جو آپؐ نے ایران کے شہنشاہ ''کسریٰ'' ،روم کے بادشاہ ''قیصر'' ، مصر کے بادشاہ ''مقوقس''، حبشہ کے بادشاہ ''نجاشی'' اور دوسرے بادشاہوں کو بھیجے تھے. بعض محققین نے آنحضرتؐ کے ان خطوط کو اپنی مستقل کتابوں میں جمع کیا ہے(ا(

۴۔ رسول خداؐ نے اسلام کے مقاصد کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے اور اسلامی حکومت کے استحکام کے لئے بہت سے قبیلوں اور شہروں کے لئے حکام معین فرمائے تھے ہم یہاں اس سلسلے میں بطور مثال ایک نمونے کا ذکر کرتے ہیں پیغمبر اسلامؐ نے رفاعہ بن زید کو اپنا نمائندہ بنا کر انھیں ان کے اپنے قبیلے کی طرف روانہ کیا اور خط میں یوں تحریر فرمایا:

''بسم اللہ الرحمن الرحیم ،(ھذا کتاب) من

)۲(جیسے کہ ''الوثائق السیاسیہ'' (مؤلفہ محمد حمید اللہ) ''مکاتیب الرسول''(مؤلفہ علی احمدی) ہیں.

محمد رسول اللہ ﷺ لرفاعۃ بن زید بعثتہ إلی قومہ عامۃ ومن دخل فیھم یدعوھم إلی اللہ والی رسولہ فمن اقبل منھم ففي حزب اللہ وحزب رسولہ ومن أدبر فلہ أمان شھرین"(۱(

شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بہت مہربان اور نہایت ہی رحم کرنے والا ہے محمد رسول خداؐ کی طرف سے یہ نوشتہ رفاعہ بن زید کے نام، بے شک میں انہیں ان کی قوم کے عام لوگوں اور قوم میں شامل ہو جانے والوں کی طرف بھیج رہا ہوں تاکہ وہ انہیں خدا اور اس کے رسول کی طرف دعوت دیں پس جس نے ان کی دعوت کو قبول کیا وہ خدا اور اس کے رسول کے گروہ میں شامل ہو گیا. اور جو ان کی دعوت سے روگردانی کرے گا اس کے لئے صرف دو ماہ کی امان ہے .

پیغمبر اسلامؐ کے ان اقدامات سے بخوبی یہ ثابت ہوتا ہے کہ آپؐ بعثت کے آغاز ہی سے ایک ایسی مضبوط حکومت بنانا چاہتے تھے کہ جس کے سائے میں انسانی معاشرے کی زندگی کے تمام پہلوؤں سے متعلق، اسلام کے احکام کو نافذ کیا جاسکے، اب سوال یہ ہے کہ رسول خداؐ کا مختلف گروہوں اور قدرتمند قبیلوں سے معاہدہ کرنا، ایک

)۱ (مکاتیب الرسول جلد ا ص ۱۴۴.

مضبوط فوج تیار کرنا، مختلف ممالک میں سفیر بھیجنا اور اس زمانے کے بادشاہوں کو خبردار کرنا، نیز ان سے خط و کتابت کرنا ساتھ ہی ساتھ شہروں کے گورنر اور حکام معین کرنا اور ایسے ہی دوسرے امور کا انجام دینا اگر سیاست نہیں تھا تو اور کیا تھا؟ پیغمبر اسلامؐ کی سیرت کے علاوہ خلفائے راشدین کا کردار اور خاص طور پر حضرت امیر المومنین علی بن ابی طالب۔ کا طرز عمل بھی شیعوں اور اہل سنت دونوں فرقوں کیلئے اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ سیاست دین سے جدا نہیں ہے. دونوں اسلامی فرقوں کے علماء نے حکومت

قائم کرنے کے سلسلے میں قرآن مجید اور سنت پیغمبرؐ سے مفصل دلیلیں بیان کی ہیں نمونے کے طور پر ہم ان میں سے بعض کا ذکر کرتے ہیں:

ابو الحسن ماوردی نے اپنی کتاب "احکام سلطانیہ" میں یوں لکھا ہے:

"الإمامۃ موضوعۃ لخلافۃ النبوۃ في حراسۃ الدین وسیاسۃ الدنیا وعقدھا لمن یقوم بھا في الأمۃ واجب بالإجماع"(۱(

امامت کو نبوت کی جانشینی کے لئے قرار دیا گیا ہے تاکہ اس کے ذریعہ دین کی حفاظت کی جاسکے اور دنیا کی سیاست و حکومت کا کام بھی چل سکے امت کا اس بات پر اتفاق ہے کہ ایسی حکومت قائم کرنا اس شخص پر واجب ہو جاتا ہے جو اس کام کو انجام دے سکتا ہو۔

)۱(الاحکام السلطانیۃ(ماوردی) باب اول ص ۵ طبع مصر.

اہل سنت کے مشہور عالم ماوردی نے اپنی اس بات کو ثابت کرنے کے لئے دو طرح کی دلیلیں پیش کی ہیں:

۱۔ عقلی دلیل

۲۔ شرعی دلیل

عقلی دلیل کو اس طرح بیان کرتے ہیں:

''لمافي طباع العقلاء من التسليم لزعيم يمنعهم من التظالم ويفعل بينهم في التنازع والتخاصم ولولاالولاة لكانوا فوضىٰ مهملين همجاً مضاعين''(۱(

کیونکہ یہ بات عقلاء کی فطرت میں ہے کہ وہ کسی رہبر کی پیروی کرتے ہیں تاکہ وہ انہیں ایک دوسرے پر ظلم وستم کرنے سے روکے اور اختلاف اور جھگڑوں کی صورت میں ان کو ایک دوسرے سے علیحدہ کرے اور اگر ایسے حکام نہ ہوتے تو لوگ پراگندہ اور پریشان ہو جاتے اور پھر کسی کام کے نہ رہ جاتے.

اور شرعی دلیل کو اس طرح بیان کرتے ہیں :

''ولکن جاء الشرع بتفویض الأمور الی ولیہ في الدین قال اللہ عزّوجلّ(یاأیّھاالذین آمنُوا

)۱(الاحکام السلطانیۃ(ماوردی) باب اول ص۵ طبع مصر.

أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمرِ مِنكُم) ففرض علینا طاعۃ أولي الأمر فینا وھم الأئمۃ الماتمرون علینا''(۱(

لیکن شرعی دلیل میں یہ ہے کہ دین کے امور کو ولی کے سپرد کر دیا گیا ہے خداوند کریم فرماتا ہے: ایمان والو اللہ کی اطاعت کرو اور رسول اور صاحبان امر کی اطاعت کرو جو تمہیں میں سے ہیں. پس خداوند نے ہم پر صاحبان امر کی اطاعت کو واجب کر دیا ہے اور وہ ہمارے امام ہیں جو ہم پر حکومت کرتے ہیں.

شیخ صدوق علیہ الرحمہ نے فضل بن شاذان سے ایک روایت نقل کی ہے جو ہمارے آٹھویں امام علی بن موسیٰ الرضا۔ کی طرف منسوب ہے اس طولانی روایت میں امام۔ نے حکومت قائم کرنے کو ایک لازمی امر قرار دیا ہے. ہم اس روایت کے چند جملے ذکر کرتے ہیں:

''إنّالا نجد فرقۃ من الفرق ولا ملۃ من الملل

بقوا وعاشوا إلاّ بقیّم ورئیس، لمالابدّ لھم

منہ من أمر الدین والدنیا، فلم یجز فیحکمۃ

الحکیم أن یترک الخلق لما یعلم انہ لابدّ لھم منہ

)۱(الاحکام السلطانیۃ(ماوردی) باب اول ص۵ طبع مصر.

والإقوام لھم إلاّبہ فیقاتلون بہ عدوھم ویقسمون بہ فیٔ ھم ویقیمون بہ جمعتھم وجماعتھم ویمنع ظالمھم من مظلومھم''(۱(

ہمیں کوئی ایسی قوم یا ملت نہیں ملے گی جو اس دنیا میں باقی رہی ہو اور اس نے زندگی گزاری ہو سوائے یہ کہ اس کے پاس ایک ایسا رہبر اور رئیس رہا ہو جس کے وہ لوگ دین اور دنیا کے امور میں محتاج رہے ہوں پس خداوند حکیم کی حکمت سے یہ بات دور ہے کہ وہ اپنے بندوں کو ایک ایسی چیز عطا نہ فرمائے جسکے وہ لوگ محتاج ہیں اور اسکے بغیر باقی نہیں رہ سکتے ہیں کیونکہ لوگ اپنے رہبر ہی کی ہمراہی میں اپنے دشمنوں کے ساتھ جنگ کرتے ہیں اور اسی کے حکم سے مال غنیمت کو تقسیم کرتے ہیں اور اس کی اقتداء میں نماز جمعہ اور بقیہ نمازیں باجماعت ادا کرتے ہیں اور رہبر ہی ظالموں سے مظلوموں کو بچاتا ہے.

اس سلسلے میں وارد ہونے والی ساری روایتوں کی تشریح کرنا اور تمام مسلمان فقہاء کے اقوال کا جائزہ لینا اس مختصر کتاب کی گنجائش سے باہر ہے اس کام کے لئے ایک مستقل کتاب درکار ہے۔ اسلامی فقہ کا دقت کے ساتھ مطالعہ کرنے سے یہ بات معلوم ہو جاتی ہے کہ شریعت کے بہت سے قوانین ایسے ہیں جو

ایکمضبوط حکومت کے بغیر نافذ

)۱ (علل الشرائع باب ۱۸۲ حدیث نمبر ۹ ص ۲۵۳

نہیں کئے جا سکتے ہیں.

اسلام ہمیں جہاد اور دفاع کرنے، ظالم سے انتقام لینے اور مظلوم کی حمایت کرنے، شرعی حدود اور تعزیرات جاری کرنے، امر بالمعروف و نھی عن المنکر انجام دینے، ایک مالی نظام برقرار کرنے اور اسلامی معاشرے میں وحدت قائم کرنے کا حکم دیتا ہے اب یہ بات واضح ہے کہ مذکورہ اہداف ایک مضبوط نظام اور حکومت کے بغیر پورے نہیں ہو سکتے کیونکہ شریعت کی حمایت اور اسلام سے دفاع کرنے کے لئے ایک تربیت یافتہ فوج کی ضرورت ہوتی ہے اور اس قسم کی طاقتور فوج تیار کرنے کے لئے ضروری ہے کہ اسلامی اصولوں کے مطابق ایک مضبوط حکومت قائم کی جائے اور اسی طرح فرائض کی پابندی اور گناہوں سے دوری کے لئے حدود اور تعزیرات کو جاری کرنا اور ظالموں سے مظلوموں کا حق لینا ایک حکومت اور نظام کے بغیر ممکن نہیں ہے کیونکہ اگر قوی حکومت نہ پائی جاتی ہو تو معاشرہ فتنہ اور آشوب کی آماجگاہ بن جائے گا اگرچہ حکومت قائم کرنے کے لازمی ہونے کے سلسلے میں ہماری ان دلیلوں کے علاوہ بھی بہت سی دلیلیں ہیں لیکن ان دلیلوں ہی سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ نہ صرف دین سیاست سے جدا نہیں ہے بلکہ شریعت کے قوانین کے مطابق اسلامی حکومت قائم کرنا ایک لازمی امر ہے جو کہ اس دنیا میں پائے جانے والے ہر اسلامی معاشرہ کے لئے ایک فریضہ قرار دیا گیا ہے۔

بائیسواں سوال

شیعہ، حضرت علی بن ابی طالب کے بیٹوں (امام حسن۔ اور امام حسین۔) کو رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بیٹے کیوں کہتے ہیں؟

جواب: تفسیر، تاریخ اور روایات کی کتابوں کا جائزہ لینے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ صرف شیعہ ہی یہ نظریہ نہیں رکھتے بلکہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ سارے مسلمان محققین چاہے وہ کسی بھی اسلامی فرقے سے تعلق رکھتے ہوں، اسی نظریئے کو قبول کرتے ہیں.

اب ہم قرآن مجید، احادیث اور مشہور مفسرین کے اقوال کی روشنی میں اس مسئلے کے دلائل کو بیان کریں گے:

قرآن مجید کی ایک اصل یہ ہے کہ اس نے ایک انسان کی نسل سے پیدا ہونے والی اولاد کو اسی انسان کی اولاد قرار دیا ہے اس اعتبار سے ایک انسان کی بیٹی یا اس کے بیٹے سے پیدا ہونے والی اولاد قرآن مجید کی نگاہ میں اس انسان کی اولاد ہے .

قرآن مجید اور سنت پیغمبرؐ میں اس حقیقت کے متعلق بہت سے شواہد موجود ہیں ان میں سے بعض یہ ہیں:

ا۔ مندرجہ ذیل آیت میں قرآن مجید نے حضرت عیسیٰ۔ کو حضرت ابراہیم۔ کی اولاد میں شمار کیا ہے جبکہ حضرت عیسیٰ۔ حضرت مریمؑ کے بیٹے ہیں اور ان کا سلسلہ نسب ماں کے ذریعہ حضرت ابراہیم۔ تک پہنچتا ہے:

)وَوَهَبْنَا لَهُ إِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ كُلًّا هَدَيْنَا وَنُوحًا هَدَيْنَا مِنْ قَبْلُ وَمِنْ ذُرِّيَّتِهِ دَاوُودَ وَسُلَيْمَانَ وَأَيُّوبَ وَيُوسُفَ وَمُوسَى وَهَارُونَ وَكَذَلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ * وَزَكَرِيَّا وَيَحْيَى وَعِيسَى)(ا(

اور ہم نے ابراہیم کو اسحاق اور یعقوب دیئے اور سب کو ہدایت بھی دی اور اس کے پہلے نوح کو ہدایت دی اور پھر ابراھیم کی اولاد میں داؤد، سلیمان، ایوب، یوسف، موسیٰ، اور ہارون قرار دیئے اور ہم اسی طرح نیک عمل کرنے والوں کو جزا دیتے ہیں اور (اسی طرح ابراہیم کی اولاد میں سے) زکریا، یحییٰ اور عیسیٰ ہیں.

مسلمان علماء اس آیۂ شریفہ کو اس بات پر شاہد قرار دیتے ہیں کہ امام حسن اور امام حسین ۲۲۸ رسول خداؐ کی اولاد اور آپؐ کی ذریت میں سے ہیں نمونے کے طور پر ہم

)ا(سورہ انعام آیت: ۸۴ اور ۸۵

یہاں ان علماء میں سے ایک عالم کے کلام کو پیش کرتے ہیں :

جلال الدین سیوطی لکھتے ہیں:

''أرسل الحجاج إلی یحییٰ بن یعمر فقال: بلغني أنک تزعم أن الحسن والحسین من ذریۃ النبي ﷺ تجدہ في کتاب اللہ وقد قرأتہ من أولہ إلی آخرہ فلم أجدہ قال: ألست تقرأ سورۃ الانعام (وَمِنْ ذُرِّيَّتِهِ دَاوُودَ وَسُلَيْمَانَ) حتی بلغ (يَحْيَىٰ وَعِيسَىٰ)؟ قال بلیٰ قال: أليس عیسیٰ من ذریۃ إبراھیم ولیس لہ أب؟ قال: صدقتَ''(۱(

حجاج نے یحییٰ بن یعمر کے پاس پیغام بھیجا اور ان سے یہ کہا: مجھے خبر ملی ہے کہ تم یہ گمان کرتے ہو کہ حسن اور حسین ۲۲۸ نبی اکرمؐ کی ذریت میں سے ہیں کیا تم نے اس بات کو کتاب خدا سے حاصل کیا ہے جبکہ میں نے قرآن مجید کو اول سے آخر تک پڑھا ہے لیکن میں نے کوئی ایسی بات اس میں نہیں دیکھی ہے.

یحییٰ بن یعمر نے کہا کیا تم نے سورہ انعام نہیں پڑھا ہے جس میں یہ ہے ''وَمِنْ ذُرِّيَّتِهِ دَاوُودَ وَسُلَيْمَانَ'' یہاں تک کہ خدا فرماتا

)۱(تفسیر در المنثور جلد ۳ ص ۲۸ طبع بیروت سورہ انعام کی ۸۴ اور ۸۵ آیت کی تفسیر کے ذیل میں.

ہے ویَحْیَی وَعِیسَی؟'' حجاج نے کہا کیوں نہیں پڑھی ہے یحییٰ نے کہا کیا حضرت عیسیٰ۔ حضرت ابراہیمؑ کی ذریت میں سے نہ تھے جب کہ ان کا کوئی باپ نہ تھا (اور ان کا سلسلہ نسب ماں کے ذریعہ حضرت ابراہیمؑ تک پہنچتا ہے) حجاج نے جواب میں کہا کہ تم بالکل صحیح کہہ رہے ہو.

مذکورہ آیت اور مفسرین کے اقوال سے یہ بات اچھی طرح معلوم ہو جاتی ہے کہ نہ صرف شیعہ بلکہ تمام مسلمان علماء امام حسن اور امام حسین ۲۲۸ کو رسول خداؐ کی ذریت اور اولاد سمجھتے ہیں.

۲۔اس قول کے صحیح ہونے پر ایک بہت ہی واضح دلیل آیہ مباہلہ ہے اب ہم اس آیت کو مفسرین کے اقوال کے ساتھ پیش کرتے ہیں:

)فَمَنْ حَاجَّکَ فِيهِ مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَکَ مِنَ الْعِلْمِ فَقُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ أَبْنَاءَنَا وَأَبْنَاءَکُمْ وَنِسَاءَنَا وَنِسَاءَکُمْ وَأَنْفُسَنَا وَأَنْفُسَکُمْ ثُمَّ نَبْتَهِلْ فَنَجْعَلْ لَعْنَتَ اللَّهِ عَلَی الْکَاذِبِينَ)(۱(

)اے پیغمبر) علم کے آجانے کے بعد جو لوگ آپ سے کٹ حجتی کریں ان سے کہہ دیجئے کہ آؤ ہم لوگ اپنے اپنے بیٹوں، اپنی اپنی عورتوں اور اپنے اپنے نفسوں کو بلائیں اور پھر خدا کی بارگاہ میں دعا کریں اور جھوٹوں پر خدا کی لعنت قرار دیں.

)۱ (سورہ آل عمران آیت: ۶۱

مفسرین کہتے ہیں کہ یہ آیت ''مباہلہ'' کے نام سے مشہور ہے یہ آیت عیسائیوں کے سرداروں سے مناظرہ کرنے کے سلسلہ میں اس وقت نازل ہوئی جب وہ کٹ حجتی سے باز نہ آئے اور آنحضرتؐ حکم خدا سے حضرت علی بن ابی طالب، حضرت فاطمہ زہرا، حضرت امام حسن اور حضرت امام حسین ۲۲۲ کی ہمراہی میں مباہلہ کے لئے تشریف لے گئے اور جب نصاری کے بزرگوں نے پیغمبر خداؐ اور ان کے اہل بیت ۲۲۲ کی یہ شان اور ہیبت دیکھی تو وہ سب خوفزدہ ہو گئے اور آنحضرتؐ کی خدمت میں آکر یہ التماس کرنے لگے کہ آنحضرتؐ ان پر لعنت نہ کریں آنحضرت نے ان کی درخواست قبول کر لی اور ان کے ساتھ ایک معاہدہ کر کے اس قصے کو ختم کر دیا شیعہ اور سنی علماء اس بات پر اتفاق نظر رکھتے ہیں کہ مباہلہ کے دن حضرت امیر المومنین، حضرت فاطمہ، حضرت امام حسن اور

حضرت امام حسین ۲۲۲ رسول خداؐ کے ہمراہ تھے اس سے یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ ''ابنائنا''(یعنی ہمارے فرزند) سے رسول خداﷺ کی مراد امام حسن اور، امام حسین ۲۲۸ ہیں اس سے یہ بھی ثابت ہو جاتا ہے کہ آیہ مباہلہ نے بھی حضرت امام حسن اور امام حسین ۲۲۸ کو رسول خدا کا فرزند قرار دیا ہے.

یہاں پر اس نکتے کا ذکر کرنا ضروری ہے کہ مفسرین نے آیہ مباہلہ کے ذیل میں بہت سی روایات ذکر کرنے کے بعد اس قول کے صحیح ہونے کی گواہی دی ہے نمونے کے طور پر ہم ان میں سے بعض مفسرین کے کلام کی طرف اشارہ کرتے ہیں:

الف: جلال الدین سیوطی نے حاکم، ابن مردویہ، اور ابو نعیم سے اور انہوں نے جابر بن عبداللہ سے نقل کیا ہے: وہ کہتے ہیں: (أنفسنا و أنفسکم) رسول اللہﷺ و علی، ''ابنائنا'' الحسن والحسین و ''نسائنا'' فاطمہ.(۱(

)انفسنا)''(یعنی ہماری جانوں) سے مراد رسول خداﷺ اور حضرت علی۔ ہیں اور (ابنائنا)(یعنی ہمارے بیٹوں) سے مراد حسن و حسین ۲۲۸ ہیں اور (نسائنا)(ہماری عورتوں) سے مراد فاطمہ زہرا ۲۳۶۱ ہیں.

ب: فخر رازی اپنی تفسیر میں اس روایت کو ذکر کرنے کے بعد کہتے ہیں :

واعلم ان ھذہ الروایۃ کالمتفق علیٰ صحتھا بین اھل التفسیر والحدیث (۲(

جان لو کہ یہ روایت ایسی حدیث ہے کہ جس کے صحیح ہونے پر اہل تفسیر اور اہل حدیث کا اتفاق ہے۔

اور پھر اس کے بعد یوں کہتے ہیں

''المسألۃ الرابعۃ: ھذہ الآیۃ دالۃ علی أن الحسن والحسین ۲۲۸ کانا ابنی رسول اللہﷺ وعد أن ید عوا أبناءہ فدعا الحسن والحسین فوجب أن یکون ابنیہ''(۳(

)۱ (تفسیر در المنثور جلد ۲ ص ۳۹ طبع بیروت اسی آیت کی تفسیر کے ذیل میں.

)۲(تفسیر ''مفاتیح الغیب'' جلد ۲ ص ۴۸۸ طبع اول مصر ۱۳۰۸ ھ

)۳(تفسیر ''مفاتیح الغیب'' جلد ۲ ص ۴۸۸ طبع اول مصر ۱۳۰۸ ھ

یہ آیہ کریمہ اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ حسنؑ اور حسینؑ پیغمبر اکرمؐ کے فرزند تھے طے یہ ہوا تھا کہ رسول خداؐ اپنے بیٹوں کو بلائیں پس آنحضرتؐ نے حسنؑ و حسینؑ ہی کو بلایا تھا پس یہ ثابت ہو گیا کہ وہ دونوں آنحضرتؐ کے بیٹے ہیں۔

ج: ابو عبداللہ قرطبیؒ اپنی تفسیر میں تحریر کرتے ہیں کہ:

)أبنائنا) دلیل علیٰ أن أبناء البنات یسمون أبناءاً.(۱(

کلمہ ابنائنا دلیل ہے کہ بیٹی سے ہونے والی اولاد بھی انسان کی اولاد کہلاتی ہے۔

۳۔ رسول خداﷺ کے اقوال شاہد ہیں کہ امام حسن اور امام حسین ۲۲۸ آنحضرتؐ کے فرزند تھے. یہاں پر ہم آنحضرتؐ کے صرف دو اقوال کی طرف اشارہ کرتے ہیں:

الف: رسول خداؐ حسنؑ اور حسینؑ کے متعلق فرماتے ہیں:

هذان ابناي مَن اَحبهما فقد اَحبنی۔(۲(

حسن اور حسین میرے دو فرزند ہیں جس نے ان سے محبت کی اس نے مجھ سے محبت کی.

ب: پیغمبر اسلام نے حسن اور حسین ۲۲۸ کی جانب اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:

اِن اِبنیّ ھٰذین ریحانتی من الدنیا.(۳(

میرے یہ دو بیٹے اس دنیا سے میرے دو پھول ہیں.

)۱(الجامع لاحکام القرآن جلد ۴ ص ۱۰۴ طبع بیروت.

)۲(تاریخ مدینہ دمشق مصنفہ ابن عساکر ترجمۃ الامام الحسین۔ ص ۵۹ حدیث ۱۰۶ طبع اول بیروت ۱۴۰۰ ھ۔

)۳(گذشتہ حوالہ ص ۶۲ حدیث نمبر ۱۱۲.

تیئیسواں سوال

شیعوں کے نزدیک یہ کیوں ضروری ہے کہ خلیفہ کو خدا اور رسولؐ ہی معین فرمائیں؟

جواب: یہ واضح ہے کہ اسلام ایک ہمیشہ رہنے والا عالمی دین ہے پیغمبر اسلامؐ کی حیات طیبہ میں آپ ہی امت کے رہبر اور ہادی تھے لیکن آپ کی رحلت کے بعد ضروری تھا کہ جو سب سے زیادہ لائق فرد ہو اسے امت اسلامیہ کی رہبری سونپ دی جائے.

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا پیغمبر اسلامؐ کے بعد خلیفہ، نص کے ذریعہ معین کیا جائے گا (یعنی خدا اور رسول ہی اپنا خلیفہ معین فرمائیں گے) یا یہ کہ خلافت ایک انتخابی عہدہ ہے؟ اس سلسلہ میں چند نظریے پائے جاتے ہیں شیعوں کا اعتقاد ہے کہ منصب خلافت نص کے ذریعہ معین ہوتا ہے یعنی یہ ضروری ہے کہ پیغمبر اکرمؐ کا جانشین خدا کی جانب سے معین کیا جائے.

جب کہ اہل سنت یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ منصب خلافت ایک انتخابی عہدہ ہے اور ضروری ہے کہ پیغمبر خداؐ کی امت، مملکت کے امور کو چلانے کے لئے کسی ایک شخص کو خلیفہ چن لے.

عصر رسالت کے حالات کا تجزیہ بتاتا ہے کہ خلیفہ کو
نص کے ذریعہ معین ہونا چاہئے.

شیعہ علماء نے عقائد کی کتابوں میں خلیفہ کے نص کے ذریعہ معین کئے جانے کے بارے میں بہت سے دلائل بیان کئے ہیں لیکن وہ دلیل جسے یہاں بیان کیا جاسکتا ہے اور جس سے شیعوں کا عقیدہ بھی واضح ہو جاتا ہے وہ عصر رسالت کے حالات کا صحیح تجزیہ ہے.

عصر رسالت میں اسلام کی داخلی اور خارجی سیاست کا یہ تقاضا تھا کہ پیغمبر خداؐ کا جانشین خدا کی طرف سے خود آنحضرتؐ کے ذریعہ معین کیا جائے کیونکہ مسلمانوں کو ہر لحظہ تین بڑی طاقتوں (روم کی سلطنت، ایران کی بادشاہت اور منافقین حجاز کی سازشوں) کی طرف سے شکست اور نابودی کا خطرہ لاحق تھا اسی طرح امت کی کچھ مصلحتیں بھی تقاضا کر رہی تھیں کہ پیغمبر اسلامؐ اپنا خلیفہ معین کر کے ساری امت کو بیرونی دشمن کی طاقت کے مقابلے میں ایک صف میں کھڑا کر دیں اور اس طرح ملت اسلامیہ کو ان داخلی اختلافات سے بچالیں جن سے دشمنوں کے نفوذ اور تسلط کا موقع فراہم ہو سکتا ہے.

اس کی وضاحت

ان تین خطرناک طاقتوں میں سے ایک طاقت روم کی بادشاہی تھی جس سے پیغمبر اسلامؐ اپنی زندگی کے آخری لمحات تک فکر مند رہے ہجرت کے آٹھویں سال فلسطین کی سرزمین پر مسلمانوں اور روم کے عیسائیوں کے درمیان پہلی جنگ ہوئی تھی اس جنگ میں اسلامی فوج کے تین کمانڈر ''جعفر طیار'' ''زید بن حارثہ'' اور ''عبداللہ بن رواحہ'' شہید ہوئے تھے اور سپاہ اسلام کو اس جنگ میں شکست کا سامنا کرنا پڑا تھا.

کفار کے مقابلے میں مسلمانوں کی اس شکست سے قیصر روم کی فوج کے حوصلے بڑھ گئے تھے اور ہر وقت اس بات کا ڈر رہتا تھا کہ کہیں وہ اسلام کے مرکزی علاقوں پر حملہ آور نہ ہو جائیں.

اسی وجہ سے پیغمبر اسلامؐ نے ہجرت کے نویں سال مسلمانوں کے ایک بڑے لشکر کو شام کے اطراف میں بھیجا تھا اور ارادہ یہ تھا کہ اگر جنگ کی نوبت آگئی تو آنحضرتؐ خود لشکر اسلام کی رہبری فرمائیں گے اس درد و رنج والے سفر میں سپاہ اسلام نے اپنی سابقہ شوکت پھر سے حاصل کی اور اسے اس کا سیاسی مقام و منصب دوبارہ مل گیا پیغمبر اسلامؐ اس فتح کے بعد بھی مطمئن نہیں ہوئے اور آپؐ نے اپنی بیماری سے چند دن پہلے مسلمانوں کی فوج کو ''اسامہ'' کی قیادت میں شام کی طرف جانے کا حکم دیا.

عصر رسالت میں مسلمانوں کی دوسری دشمن طاقت ایران کی بادشاہی تھی یہاں تک کہ ایران کے بادشاہ نے انتہائی غصے سے آنحضرتؐ کے خط کو پھاڑ دیا تھا اور آپؐ کے ایلچی کو توہین کے ساتھ باہر نکال دیا تھا اور نیز یمن کے گورنر کو خط لکھا تھا کہ پیغمبر اسلامؐ کو گرفتار کرلے اور ممانعت کی صورت میں انہیں قتل کر ڈالے.

اگرچہ ایران کا بادشاہ خسرو پرویز رسول خداؐ کے زمانے ہی میں مر گیا تھا لیکن مدتوں سے ایران کے زیر اقتدار رہنے والے ملک یمن کا مسلمانوں کے ذریعہ استقلال حاصل کر لینا ایرانی بادشاہوں کو شدید ناگوار گزرا اس وجہ سے ایران کی سطوت شاہی کے لئے اسلام کی طاقت کو پھلتا پھولتا دیکھنا برداشت کے قابل نہیں تھا.

مسلمانوں کو تیسرا خطرہ منافقین کے گروہ سے تھا منافقوں کی ہمیشہ سے یہ کوشش تھی کہ مسلمانوں کے درمیان تفرقہ اندازی کے ذریعہ فتنہ و فساد پیدا کریں ان لوگوں کے نفاق اور کینہ کا اس بات سے بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ انہوں نے تبوک سے مدینہ کے راستے میں حضرت رسول اکرم ﷺ کو قتل کرنے کا منصوبہ تیار کیا تھا یہ لوگ سمجھ رہے تھے کہ رسول خداؐ کی رحلت سے اسلام کی تحریک ختم ہو جائے گی اور وہ لوگ آسودہ خاطر ہو جائیں گے منافقین کے عزائم اور ان کی سازشوں کو آشکار کرنے کے لئے قرآن مجید نے ان سورتوں: آل عمران، نساء، مائدہ، انفال، توبہ، عنکبوت، احزاب، محمد، فتح، مجادلہ، حدید، منافقین اور حشر میں ان کا تذکرہ فرمایا ہے.(۱(

اسلام کے ایسے سرسخت اور خطرناک دشمنوں کی موجودگی میں کیا یہ صحیح تھا کہ رسول خداؐ تنہا مسلمانوں کے دینی اور سیاسی امور کی رہبری کے لئے اپنا کوئی جانشین معین نہ فرماتے؟

اس وقت کے اجتماعی حالات کے مطالعہ سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ یہ ضروری تھا کہ رسول خداؐ اپنے بعد اپنا جانشین معین کر کے ہر قسم کے اختلاف کا سد باب کر دیتے اور ایک مستحکم دفاعی نظام تشکیل دیتے ہوئے اسلامی وحدت کو دوام بخشتے اگر

)۱(فروغ ابدیت، مولف استاد جعفر سبحانی (اقتباس(

آنحضرتؐ اپنا کوئی خلیفہ معین نہ فرماتے تو عالم اسلام کو شدید قسم کے ناگوار واقعات کا سامنا کرنا پڑتا اور نتیجہ ہر گروہ یہ کہنے لگتا کہ خلیفہ ہم میں سے ہونا چاہئے.

رسول خداﷺ کی حدیثیں

اجتماعی حالات کے تقاضوں اور چند دوسری وجوہات کی بنیاد پر آنحضرتﷺ نے اول بعثت سے لے کر اپنی زندگی کے آخری ایام تک اپنی جانشینی کے مسئلے کو بیان فرمایا ہے آپؐ نے دعوت ذوالعشیرہ میں جہاں اپنی رسالت کا اعلان فرمایا وہیں اپنے جانشین کو بھی معین فرمادیا تھا اور اسی طرح اپنی زندگی کے آخری ایام میں حجۃ الوداع سے لوٹتے وقت غدیر خم کے میدان میں اپنے جانشین کا اعلان فرمایا تھا اور نہ صرف ان دو مقامات پر بلکہ آنحضرتؐ اپنی ساری زندگی کے دوران مختلف مقامات پر اپنے جانشین کی شناخت کراتے رہے مزید تفصیلات کے لئے اسی کتاب میں تیسرے سوال کے جواب کا مطالعہ فرمائیں ہم نے وہاں پیغمبر اسلامؐ کی حدیثوں کے تین ایسے نمونے ذکر کئے ہیں جن میں آنحضرت کے جانشنین کا تذکرہ ہے وہاں ہم نے ان حدیثوں کے ماخذ بھی ذکر کئے ہیں .

صدر اسلام کے حالات اور پیغمبر اسلامؐ کی ان حدیثوں (جن میں آنحضرتﷺ نے حضرت علی۔ کو اپنا جانشین مقرر فرمایا ہے) کے مطالعے سے یہ بات اچھی طرح ثابت ہو جاتی ہے کہ خلیفہ خدا اور رسول ہی کی طرف سے معین ہوتا ہے۔

چوبیسواں سوال

کیا غیر خدا کی قسم کھانا شرک ہے؟

جواب: لفظ توحید اور شرک کے معنی جاننے کے لئے ضروری ہے کہ قرآن کی آیات اور حدیثوں کا مطالعہ کیا جائے کیونکہ قرآن مجید اور سنت رسولؐ حق کو باطل سے اور توحید کو شرک سے جدا کرنے کا بہترین معیار ہیں.

اس بنیاد پر بہتر ہے کہ ہر قسم کے نظریہ اور عمل کو قرآن اور سنت پیغمبرؐ کی روشنی میں زندہ اور بے تعصب ضمیر کے ساتھ پرکھیں اب ہم یہاں پر قرآن و سنت سے غیر خدا کی قسم کھانے کے جائز ہونے پر چند دلیلیں پیش کریں گے:

ا۔ قرآن مجید میں چند محترم مخلوقات جیسے ''پیغمبر اکرمؐ'' اور ''روح انسان'' ''قلم'' ''سورج'' ''چاند'' ''ستارے'' ''دن اور رات'' ''آسمان اور زمین'' ''زمانے'' ''پہاڑ اور سمندر'' وغیرہ کی قسم کھائی گئی ہے یہاں ہم ان میں سے بعض کا ذکر کرتے ہیں:

الف: (لَعَمْرُکَ إِنَّهُمْ لَفِي سَكْرَتِهِمْ يَعْمَهُونَ)(ا(

)ا(سورہ حجر آیت ۷۲

)پیغمبرؐ!) آپ کی جان کی قسم یہ لوگ اپنی خواہش نفس کے نشے میں اندھے ہو رہے ہیں.

ب: (وَالشَّمْسِ وَضُحَاهَا وَالْقَمَرِ إِذَا تَلَاهَا وَالنَّهَارِ إِذَا جَلَّاهَا وَاللَّيْلِ إِذَا يَغْشَاهَا وَالسَّمَاءِ وَمَا بَنَاهَا وَالْأَرْضِ وَمَا طَحَاهَا وَنَفْسٍ وَمَا سَوَّاهَا فَأَلْهَمَهَا فُجُورَهَا وَتَقْوَاهَا...)(ا(

آفتاب اور اس کی روشنی کی قسم. اور چاند کی قسم جب وہ اس کے پیچھے چلے. اور دن کی قسم جب وہ روشنی بخشے. اور رات کی قسم جب وہ اسے ڈھانک لے. اور آسمان کی قسم اور جس نے اسے بنایا. اور زمین کی قسم اور جس نے اسے بچھایا. اور نفس کی قسم اور جس نے اسے درست کیا. پھر بدی اور تقوی کی ہدایت دی ہے.

ج: (وَالنَّجْمِ إِذَا هَوَى)(۲(

قسم ہے ستارے کی جب وہ ٹوٹا.

د: (وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُونَ)(۳(

)ا(سورہ شمس آیت ا تا ۸

)۲(سورہ نجم آیت: ا

)۳(سورہ قلم آیت:۱

ھ: (وَالْعَصْرِ ةإِنَّ الْإِنسانَ لَفِي خُسْرٍ)(۱(

قسم ہے عصر کی. بے شک انسان خسارے میں ہے.

و: (وَالْفَجْرِ ةوَلَيَالٍ عَشْرٍ)(۲(

قسم ہے فجر کی. اور دس راتوں کی.

ز: (وَالطُّورِ ةوَكِتَابٍ مَسْطُورٍ ةفِي رَقٍّ مَنْشُورٍ ةوَالْبَيْتِ الْمَعْمُورِ ةوَالسَّقْفِ الْمَرْفُوعِ ةوَالْبَحْرِ الْمَسْجُورِ)(۳(

طور کی قسم. اور لکھی ہوئی کتاب کی قسم. جو کشادہ اوراق میں ہے. اور بیت معمور کی قسم. اور بلند چھت (آسمان) کی قسم. اور بھڑکتے ہوئے سمندر کی قسم.

اسی طرح ان سورتوں" نازعات" "مرسلات" "بروج" "طارق" "بلد" "تین" "ضحی" میں بھی دنیا کی مختلف اشیاء کی قسمیں کھائی گئی ہیں.

اگر غیر خدا کی قسم کھانا شرک ہوتا تو اس قرآن مجید میں جو توحید کا مظہر ہے، ہر گز غیر خدا کی قسمیں نہ کھائی جاتیں اور اگر اس قسم کی قسمیں کھانا صرف خداوند کی

)۱(سورہ عصر آیت ۱ اور ۲.

)۲(سورہ فجر آیت: ۱ اور ۲.

)۳(سورہ طور آیت نمبر ۱ سے ۶ تک.

خصوصیات میں سے ہوتا تو قرآن مجید میں ضرور اس بات کی طرف متوجہ کرادیا جاتا تاکہ بعد میں کسی کو دھوکہ نہ ہو.

۲۔ دنیا کے سارے مسلمان رسول خداؐ کو اپنے لئے اسوہ عمل سمجھتے ہیں اور آنحضرتؐ کی سیرت کو حق اور باطل کی شناخت کے لئے میزان قرار دیتے ہیں.

عالم اسلام کے محققین اور اہل سنت کی صحیح اور مسند کتابوں کے مؤلفین نے پیغمبر خداؐ کی بہت سی ایسی قسموں کو نقل کیا ہے جو حضور اکرمؐ نے غیر خدا کے نام سے کھائی تھیں.

احمد بن حنبل نے اپنی کتاب مسند میں پیغمبر اسلامؐ سے یوں روایت کی ہے:

"فلعمري لأن تتكلم بمعروف وتنهىٰ عن منكر خير من أن تسكت"..(۱(

میری جان کی قسم! تمہارے خاموش رہنے سے کہیں بہتر یہ ہے کہ تم امر بمعروف اور نھی از منکر کرو.

مسلم بن حجاج کا اپنی کتاب صحیح میں بیان ہے کہ:

جاء رجل إلى النبي ﷺ فقال: يارسول الله أيّ الصدقة أعظم أجرًا؟ فقال: أما وأبيك لتنبأنّه أن تصدق وأنت صحيح شحيح تخشى الفقر وتأمل البقاء.....(۲(

)۱(مسند احمد جلد ۵ ص ۲۲۴ اور ۲۲۵ حدیث بشیر ابن خصاصیہ سدوسی.

)۲(صحیح مسلم، جزء سوم، طبع مصر، کتاب الزکاۃ، باب بیان ان افضل الصدقۃ، صدقۃ الصحیح الشحیح، ص ۹۳ اور ۹۴

ایک شخص نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ کونسا صدقہ زیادہ اجر رکھتا ہے؟ پیغمبر اسلامؐ نے فرمایا: تمہارے باپ کی قسم یقیناً تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ (سب سے زیادہ اجر والا صدقہ) یہ ہے کہ تم صحت مندی، آرزوئے حیات، خوف فقر اور امید بقاء کے ساتھ صدقہ دو .جو لوگ دنیا کے اکثر مسلمانوں کو صرف اس وجہ سے مشرک سمجھتے ہیں کہ وہ سب غیر خدا کی قسم کھاتے ہیں تو وہ پیغمبر خدا کے اس عمل کی کیا تاویل کریں گے؟

۳۔ کتاب خدا اور سنت پیغمبرؐ کے علاوہ رسول خداؐ کے انتہائی قریبی اور متعبر اصحاب کی سیرت بھی اس عمل کے جائز ہونے کی بہترین دلیل ہے.

عالم اسلام کے عظیم الشأن رہبر حضرت علی بن ابی طالب ـ نے اپنے بہت سے گہر بار خطبوں اور بیانات میں اپنی جان کی قسم کھائی ہے وہ فرماتے ہیں:

ولعمري ليضعفن لكم التيه من بعدي أضعافا)۱(

میری جان کی قسم میرے بعد تمہاری یہ حیرانی اور سر گردانی کئی گنا بڑھ جائے گی۔

ایک جگہ اور فرماتے ہیں:

"ولعمري لأن لم تنزع عن غيك وشقاقك لتعرفنهم عن قليل يطلبونك"(۲)

)۱(نہج البلاغہ (محمد عبدہ) خطبہ نمبر ۱۶۱.

)۲(نہج البلاغہ (محمد عبدہ) مکتوب نمبر ۹.

میری جان کی قسم اگر تم اپنی گمراہی اور شقاوت سے دست بردار نہ ہوئے تو عنقریب انہیں دیکھو گے کہ وہ لوگ تمہیں بھی ڈھونڈ لیں گے.)۱(

اب واضح ہے کہ ان سب روایات کے مقابلے میں اجتہاد اور استحسان کی کوئی حیثیت نہیں ہے اور کوئی بھی دلیل قرآن مجید کی آیتوں، پیغمبر اکرمؐ کی سنت اور معتبر صحابہ کی سیرت کو غلط قرار نہیں دے سکتی اور نہ ہی ان کی طرف شرک کی نسبت دے سکتی ہے.

نتیجہ: گزشتہ دلائل کے مجموعے سے اچھی طرح معلوم ہو جاتا ہے کہ قرآن و سنت اور مومنین کی سیرت کے اعتبار سے غیر خدا کی قسم کھانا ایک جائز اور مسلم اصل کی حیثیت رکھتا ہے اور کسی بھی طرح عقیدہ توحید سے نہیں ٹکراتا.

لہذا اگر کوئی روایت ظاہری طور پر ان یقینی دلیلیوں کی مخالفت کرے تو اس کی تاویل کرنی چاہیے تاکہ وہ قرآن و روایات کی مسلم اصل کے موافق ہو جائے

.

بعض اوقات ایک ایسی مبہم سی روایت کو پیش کیا جاتا ہے جس میں اس عمل کی مخالفت کی گئی ہے یہاں ہم اس روایت کو اسکے جواب کے ساتھ بیان کرتے ہیں:

إن رسول الله سمع عمر وهو يقول: وأبي، فقال: إن الله ينهاكم أن تحلفوا بآبائكم ومن كان حالفاً فليحلف بالله أو ليسكت(۲)

)۱(اور زیادہ موارد کی آگاہی کے لئے خطبہ نمبر ۱۸۲، ۱۶۸، اور ۱۸۷ اور مکتوب نمبر ۶ اور ۵۴ کی طرف رجوع فرمایئے.

)۲(سنن الکبری، جلد ۱۰ ص ۲۹ اور سنن نسائی جلد ۷ صفحہ نمبر ۱۵ اور ۶.

رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت عمر کو یہ کہتے ہوئے سنا میرے باپ کی قسم (یہ سن کر) پیغمبر اسلامؐ نے فرمایا خداوند کریم نے تم لوگوں کو اپنے باپ کی قسم کھانے سے منع کیا ہے اور جسے قسم کھانا ہو وہ خدا کی قسم کھائے یا پھر چپ رہے.

اگرچہ یہ حدیث قرآن کی ان آیات اور روایات کے مقابلے میں جو غیر خدا

کی قسم کھانے کو جائز قرار دیتی ہیں، کوئی حیثیت نہیں رکھتی ہے لیکن پھر بھی اس حدیث کو آیات اور روایات کے ہمراہ لانے کے لئے یہ کہنا ضروری ہے کہ پیغمبر اسلامؐ نے حضرت عمر اور ان جیسے افراد کو اپنے باپ کی قسم کھانے سے اس لئے روکا تھا کہ ان کے باپ مسلمان نہیں تھے اور غیر مسلموں کی قسمیں نہیں کھائی جاسکتیں۔

پچیسواں سوال

کیااولیائے خدا سے توسل کرنا شرک اور بدعت ہے؟

جواب: توسل کے معنی یہ ہیں کہ تقرب الٰہی کے لئے کسی محترم مخلوق کو اپنے اور خدا کے درمیان وسیلہ قرار دیا جائے.

ابن منظور لسان العرب میں لکھتے ہیں :

''توسّل اِلیہ بکذا، تقرب اِلیہ بحرمۃ آصرۃ تعطفہ علیہ''(۱(

اس نے فلان چیز کے ذریعہ اس شخصیت سے توسل کیا یعنی اس نے اس چیز کی حرمت کے ذریعہ اس ذات سے قربت اختیار کی جب کہ اس کی حرمت سے اپنی قلبی محبت کو اپنے اندر محسوس کیا.

قرآن مجید فرماتا ہے:

)۱(لسان العرب، جلد ۱۱ ص ۷۳۴.

)یَاأَیُّہَاالَّذِینَ آمَنُوااتَّقُوااللہَ وَابْتَغُوااِلَیْہِ الْوَسِیلَۃَ وَجَاہِدُوافِی سَبِیلِہِ لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُونَ)(۱(

ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور اس تک پہنچنے کا وسیلہ تلاش کرو اور اس کی راہ میں جہاد کرو کہ شاید اس طرح کامیاب ہو جاؤ.

جوہری ''صحاح اللّغۃ'' میں ''وسیلہ'' کی تعریف کو یوں بیان کرتے ہیں:

''الوسیلۃ ما یتقرّب بہ الی الغیر''

وسیلہ ایسی چیز ہے جسکے ذریعہ کسی دوسرے کے قریب ہوا جائے اس اعتبار سے بعض اوقات انسان کے نیک اعمال اور خدا کی خالص عبادت اس کیلئے وسیلہ بنتے ہیں اور کبھی کبھی خدا کے محترم اور مقدس بندے انسان کے لئے وسیلہ قرار پاتے ہیں.

توسل کی قسمیں

توسل کی تین قسمیں ہیں:

۱۔ نیک اعمال سے توسل؛ جلال الدین سیوطی نے اس آیت (وَابْتَغُوا إِلَيْهِ الْوَسِيلَةَ) کے ذیل میں اس روایت کا ذکر کیا ہے:

عن قتادة في قوله تعالى "وَابْتَغُوا إِلَيْهِ الْوَسِيلَةَ" قال: تقرّبوا إلى الله بطاعته والعمل بما يرضيه (۱(

)۱(سورہ مائدہ آیت: ۳۵.

)۲(تفسیر در المنثور جلد ۲ ص ۲۸۰ مطبوعہ بیروت اسی آیت کی تفسیر کے ذیل میں.

)وَابْتَغُوا إِلَيْهِ الْوَسِيلَةَ)اس آیت کے متعلق قتادہ کا بیان ہے. کہ خدا کی اطاعت اور اس کو خوشنود کرنے والے عمل کے ذریعہ خدا سے قربت اختیار کرو.

۲۔ خدا کے نیک بندوں کی دعاؤں سے توسل! قرآن مجید نے جناب یوسف۔ کے بھائیوں اور جناب یعقوبؑ کی گفتگو کو یوں بیان کیا ہے:

)قَالُوا يَا أَبَانَا اسْتَغْفِرْ لَنَا ذُنُوبَنَا إِنَّا كُنَّا خَاطِئِينَ قَالَ سَوْفَ أَسْتَغْفِرُ لَكُمْ رَبِّي إِنَّهُ هُوَ الْغَفُورُ الرَّحِيمُ)(۱(

ان لوگوں نے کہا باباجان اب آپ ہمارے گناہوں کیلئے استغفار کریں ہم یقیناً خطاکار تھے انہوں نے کہا کہ میں عنقریب تمہارے حق میں استغفار کروں گا کہ میرا پروردگار بہت بخشنے والا اور مہربان ہے.

اس آیت سے اچھی طرح معلوم ہو جاتا ہے کہ جناب یعقوب۔ کے بیٹوں نے اپنے والد کی دعا اور ان کے استغفار سے توسل کیا تھا حضرت یعقوب۔ نے بھی نہ صرف ان کے توسل پر کوئی اعتراض نہیں کیا بلکہ ان سے وعدہ بھی کیا کہ وہ ان کے حق میں دعا اور استغفار کریں گے.

)۱(سورہ یوسف آیت نمبر ۹۷ اور ۹۸.

۳۔ قرب الٰہی کے حصول کیلئے خداوند کریم کے محترم اور مقدس بندوں سے توسل :

اس قسم کے توسل کی مثالیں، اوائل اسلام میں آنحضرتؐ کے اصحاب کی سیرت میں دکھائی دیتی ہیں اب ہم یہاں اس مسئلے کی دلیلوں کو احادیث اور سیرت

صحابہ کی روشنی میں پیش کرتے ہیں.

احمد ابن حنبل نے اپنی کتاب مسند میں عثمان بن حنیف سے یہ روایت نقل کی ہے:

إن رجلاً ضرير البصر أتى النبيّ ﷺ فقال ادع الله أن يعافيني قال: إن شئت دعوت لك وإن شئت أخرت ذاك فهو خير فقال ادعه فأمره أن يتوضأ فيحسن وضوءه فيصلي ركعتين ويدعو بهذا الدعاء: اللّهم إنّي أسئلك وأتوجه إليك بنبيك محمدٍ نبيّ الرحمة يا محمد إنّي توجّهت بك إلى ربّي في حاجتي هذه، فتقضي لي اللّهم شفّعه فيّ. (۱(

ایک نابینا شخص رسول خدا ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ آپؐ پروردگار سے دعا کیجئے کہ وہ مجھے شفا بخشے آنحضرت نے فرمایا اگر تم چاہتے ہو تو میں تمہارے لئے دعا کرتا

)۱(مسند احمد بن حنبل، جلد ۴ ص ۱۳۸ روایات عثمان بن حنیف، مستدرک حاکم؛ جلد ۱ کتاب صلوۃ التطوع

طبع بیروت ۳۱۳، سنن ابن ماجہ جلد ا ص ۴۴۱ طبع دار احیاء الکتب العربیہ، ''التاج'' جلد ا ص ۲۸۶، الجامع الصغیر (سیوطی) ص ۵۹، التوسل والوسیلہ (ابن تیمیہ) ص ۹۸ طبع بیروت.

ہوں لیکن اگر چاہو تو اس سلسلے میں کچھ تاخیر کر دی جائے اور یہی بہتر بھی ہے اس نے عرض کیا کہ آپؐ دعا فرمادیں تو پیغمبر خداؐ نے اس شخص کو حکم دیا کہ وہ وضو کو اچھے طریقے سے انجام دے اور پھر دو رکعت نماز بجالائے اور یہ دعا پڑھے: اے معبود میں تجھ سے سوال کرتا ہوں اور تیری طرف متوجہ ہوتا ہوں تیرے پیغمبر نبی رحمتؐ حضرت محمدؐ کے وسیلے سے اے محمدؐ میں آپکے وسیلے سے اپنی اس حاجت میں اپنے پروردگار کی طرف متوجہ ہوتا ہوں تا کہ آپ میری حاجت کو قبول فرمائیں اے معبود ان کو میرے لئے شفیع قرار دے.

محدثین نے اس حدیث کو صحیح قرار دیا ہے جیسا کہ حاکم نیشاپوری نے اپنی کتاب مستدرک میں اس حدیث کا ذکر کرنے کے بعد کہا ہے کہ '' یہ ایک صحیح حدیث ہے'' ابن ماجہ نے بھی ابو اسحاق سے نقل کرتے ہوئے کہا ہے کہ: '' یہ روایت صحیح ہے'' اسی طرح ترمذی نے اپنی کتاب ''ابواب الادعیہ'' میں اس حدیث کے صحیح ہونے کی تائید کی ہے ''محمد بن نسیب الرفاعی'' نے بھی اپنی کتاب ''التوصل الی حقیقۃ التوسل'' میں یوں بیان کیا ہے

لاشک اِن ھذا الحدیث صحیح و مشھور... وقد ثبت فیہ بلاشک ولاریب ارتداد بصر الأعمی بدعاء رسول اللہ ﷺ (۱(

)۱(التوصل الی حقیقۃ التوسل ص ۱۵۸ طبع بیروت.

بے شک یہ حدیث صحیح اور مشہور ہے... بہ تحقیق اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ رسول خدا ﷺ کی دعا کے نتیجے میں اس اندھے شخص کی بصارت لوٹ آئی تھی اس حدیث سے اچھی طرح واضح ہو جاتا ہے کہ حاجات کے لئے پیغمبر خداؐ کو وسیلہ بنا کر ان سے توسل کرنا ایک جائز عمل ہے کیونکہ رسول خدا نے اس نابینا شخص کو حکم دیا تھا کہ وہ اس طرح دعا کرے اور حضور (ص) کو اپنے اور پروردگار کے درمیان وسیلہ قرار دے اس طرح یہ حدیث اولیائے الٰہی سے توسل کو ثابت کرتی ہے.

۲۔ ابو عبداللہ بخاری کا اپنی کتاب صحیح میں بیان ہے :

اِن عمر بن الخطاب رضي اللہ عنہ کان اِذا قحطوا استسقیٰ بالعباس بن عبد المطلب فقال: اللّٰھم اِن کنّا نتوسّل اِلیک بنبیّنا فتسقینا واِنّا نتوسّل اِلیک بعمّ نبیّنا فاسقنا: قال، فیُسقون.(۱(

جب قحط پڑتا تھا تو عمر ابن خطاب ہمیشہ عباس ابن عبد المطلب کے وسیلے سے بارش کیلئے دعا کرتے تھے اور کہتے تھے ''خدایا! پیغمبر کے زمانے میں ہم آنحضرتؐ سے متوسل ہوتے تھے اور تو ہم پر بارش نازل کرتا تھا اب ہم پیغمبرؐ کے چچا کے وسیلے سے تجھ

)۱(صحیح بخاری جز ۲ کتاب الجمعہ باب الاستسقاء ص ۲۷ طبع مصر.

سے توسل کر رہے ہیں تا کہ تو ہمیں سیراب کر دے'' چنانچہ اس طرح وہ سیراب کر دیئے جاتے تھے.

۳۔ صدر اسلام کے مسلمانوں کے درمیان اولیائے الٰہی سے توسل اس حد

تک رائج تھا کہ وہ لوگ اپنے اشعار میں بھی حضورؐ کے وسیلہ ہونے کا تذکرہ کرتے تھے بطور مثال سواد ابن قارب کا یہ قصیدہ ملاحظہ فرمائیں جس میں انہوں

نے حضور اکرم ﷺ کی مدح سرائی کی ہے:

واشھد أن لا ربّ غیرہ وأنک مأمون علیٰ کل غالب

وأنک أدنی المرسلین وسیلۃ إلی اللہ یا بن الأکرمین الأطائب (۱(

میں گواہی دیتا ہوں کہ خدا کے علاوہ کوئی پروردگار نہیں ہے اور آپؐ ہر پوشیدہ چیز کے لئے امین ہیں اور اے مکرم اور پاک طینت افراد کے فرزند میں گواہی دیتا ہوں کہ آپؐ تمام نبیوں کے درمیان پروردگار کا نزدیک ترین وسیلہ ہیں.

پیغمبر خدا نے سواد بن قارب سے یہ قصیدہ سنا تھا لیکن اس کے اشعار پر کوئی اعتراض نہیں کیا تھا اور نہ ہی سواد کے اس کام کو شرک و بدعت قرار دیا تھا.

امام شافعی نے بھی اپنے ان اشعار میں اس حقیقت کو بیان کیا ہے:

آل النبیّ ذریعتي ھم الیہ وسیلتي

أرجو بھم أعطی غداً بیدي الیمین صحیفتي (۲(

)۱ (الدر السنیہ، مؤلفہ سید احمد بن زینی دحلان ص۲۹ طبرانی سے نقل کرتے ہوئے.

)۲(الصواعق المحرقہ، مؤلفہ ابن حجر عسقلانی ص۱۷۸ طبع قاہرہ.

پروردگار تک پہنچنے کے لئے پیغمبر کی آل میرے لئے وسیلہ ہیں میں ان کی وجہ سے امیدوار ہوں کہ میرا نامہ اعمال میرے دائیں ہاتھ میں دیا جائے گا.

اولیائے الٰہی سے توسل کے جائز ہونے کے سلسلے میں بہت سی روایات آئی ہیں اور انہی روایات کی روشنی میں پیغمبر خداؐ صحابہ اور علمائے اسلام کا اس موضوع سے متعلق نظریہ معلوم ہو جاتا ہے اور مزید گفتگو کی چنداں ضرورت نہیں رہتی ہے۔ ہمارے اسی بیان سے ان لوگوں کا یہ کلام کہ خدا کے محترم بندوں سے توسل کرنا شرک اور بدعت ہے، باطل ہو جاتا ہے۔ چھبیسواں سوال

کیا اولیائے خدا کی ولادت کے موقع پر جشن منانا بدعت

یا شرک ہے؟

جواب: خدا کے نیک بندوں کی یاد منانا اور ان کی ولادت کے موقعے پر جشن منانا، عقلاء کی نظر میں ایک واضح مسئلہ ہے لیکن پھر بھی ہم اس عمل کے جائز ہونے کی دلیلیں اس لئے پیش کر رہے ہیں تاکہ کسی قسم کا شبہ باقی نہ رہ جائے.

۱۔ان کی یاد منانے میں محبت کا اظہار ہوتا ہے.

قرآن مجید نے مسلمانوں کو پیغمبر خداؐ اور ان کے اہل بیت ۲۲۲ سے محبت کرنے کا حکم دیا ہے:

) قُل لا أسألکم علیہ أجراً إلا المودّۃ في القربیٰ (۱(

)۱(سورہ شوریٰ آیت: ۲۳

)اے پیغمبر) آپ کہہ دیجئے کہ میں تم سے اس تبلیغ رسالت کا کوئی اجر نہیں مانگتا سوائے اس کے کہ میرے اقربا سے محبت کرو.

اس میں شک نہیں ہے کہ مسلمان اولیاء خدا کی یاد منا کر ان سے اپنی اس

محبت والفت کا اظہار کرتے ہیں جس کا حکم قرآن مجید نے دیا ہے.

۲۔ پیغمبر اکرمؐ کی یاد منانا آنحضرتؐ کی تعظیم کا اظہار ہے

قرآن مجید نے رسول خدا کی نصرت کرنے کے علاوہ آپ کے احترام کو بھی کامیابی اور سعادت کا معیار قرار دیا ہے.

)فَالَّذِينَ آمَنُوا بِهِ وَعَزَّرُوهُ وَنَصَرُوهُ وَاتَّبَعُوا النُّورَ الَّذِي أُنزِلَ مَعَهُ أُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ)(۱

پس جو لوگ پیغمبر پر ایمان لائے اور ان کا احترام کیا، ان کی امداد کی اور اس نور کا اتباع کیا جو ان کے ساتھ نازل ہوا ہے وہی در حقیقت فلاح یافتہ اور کامیاب ہیں.

گزشتہ آیت کی روشنی میں بخوبی معلوم ہو جاتا ہے کہ اسلام کی نگاہ میں پیغمبر اکرمؐ کا احترام انتہائی پسندیدہ کام ہے اور ان کی یاد کو ہمیشہ زندہ رکھنے اور ان کے بلند مقام کی تعظیم کے لئے جشن منانا خداوند عالم کی خوشنودی کا باعث بنتا ہے کیونکہ اس آیت میں

)۱(سورہ اعراف آیت: ۱۵۷

فلاح یافتہ لوگوں کے لئے چار صفات ذکر کی گئی ہیں:

الف: ایمان (الَّذِينَ آمَنُوا بِهِ) وہ لوگ نبیؐ پر ایمان لائے.

ب: ان کے نور کی پیروی (وَاتَّبَعُوا النُّورَ الَّذِي أُنزِلَ مَعَهُ) اور اس نور کی پیروی کی جو ان کے ساتھ نازل ہوا.

ج: ان کی نصرت کرنا (وَنَصَرُوهُ) اور انہوں نے ان کی نصرت کی.

د: پیغمبر اکرمؐ کی تعظیم (وَعَزَّرُوهُ) اور ان کا احترام کیا.

اس اعتبار سے پیغمبر اکرمؐ پر ایمان لانے اور ان کی نصرت کرنے اور ان کے دیئے ہوئے احکام کی پیروی کرنے کے علاوہ آنحضرتؐ کا احترام اور آپؐ کی تعظیم بھی ایک ضروری امر ہے اس لحاظ سے حضور سرور کائناتؐ کی یاد کو باقی رکھنا "وَعَزَّرُوهُ" کے امر کا امتثال ہے.

۳۔ انکی یاد منانے میں خداوند عالم کی پیروی ہے.

خداوند عالم قرآن مجید میں پیغمبر اکرمؐ کی عظمت کو بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے:

)وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ)(۱

اور ہم نے آپ کی خاطر آپ کا ذکر بلند کر دیا.

اس آیت کی روشنی میں معلوم ہو جاتا ہے کہ خداوند عالم یہ چاہتا ہے کہ پیغمبر اکرمؐ

)۱(سورہ انشراح آیت ۴

کی عظمت و جلال کو اس دنیا میں پھیلا دے اور خود ذات کردگار نے بھی قرآن مجید میں آنحضرتؐ کی تعظیم کی ہے اس لئے ہم بھی قرآن مجید کی پیروی کرتے ہوئے پیغمبر اکرمؐ جو کہ اسوہ کمال و فضیلت ہیں کی یاد منا کر ان کی تعظیم کرتے ہیں. اور اس طرح پروردگار عالم کی پیروی کرتے ہیں.

واضح ہے کہ مسلمانوں کا ان محافل کو منعقد کرنے کا مقصد پیغمبر اکرمؐ کے ذکر کو بلند کرنے کے علاوہ کچھ نہیں ہے.

۴۔ وحی کا نازل ہونا دستر خوان کے نازل ہونے سے کم نہیں ہے

قرآن مجید نے حضرت عیسیٰ۔ کی دعا کو یوں بیان کیا ہے:

)قَالَ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ اللَّهُمَّ رَبَّنَا أَنزِلْ عَلَيْنَا مَائِدَةً مِّنَ السَّمَاءِ تَكُونُ لَنَا عِيدًا لِّأَوَّلِنَا وَآخِرِنَا وَآيَةً مِّنكَ وَارْزُقْنَا وَأَنتَ خَيْرُ الرَّازِقِينَ)(۱(

عیسیٰ ابن مریم نے کہا اے خدا! اے ہمارے پروردگار! ہم پر آسمان سے دستر خوان نازل فرما تا کہ ہمارے اگلوں اور پچھلوں کے لئے عید ہو جائے اور تیری طرف سے نشانی بن جائے.

حضرت عیسیٰ۔ نے خداوند عالم سے درخواست کی تھی کہ ان پر آسمان سے ایک

)۱(سورہ مائدہ آیت: ۱۱۴

دستر خوان نازل کیا جائے تا کہ اس کے نازل ہونے کا دن ان کیلئے عید بن جائے.

اب ہم یہ سوال کرتے ہیں کہ جب خدا کے ایک نبی کی نگاہ میں دستر خوان (جس سے جسمانی لذت حاصل ہوتی ہے) کے نازل ہونے کا دن عید ہے تو اب اگر دنیا کے مسلمان وحی کے نازل ہونے اور (پیغمبر اکرمؐ جو انسانوں کی بخشش کا ذریعہ اور حیات ابدی کا سرچشمہ ہیں) کی ولادت باسعادت کے دن کو عید قرار دیتے ہوئے اس دن جشن منائیں اور محفلیں منعقد کریں تو کیا یہ شرک یا بدعت ہو جائے گا؟!

۵۔ مسلمانوں کی سیرت

دین اسلام کے پیرو پیغمبر اکرمؐ کی یاد کو ہمیشہ زندہ رکھنے کے لئے مدتوں سے اس قسم کی جشن منعقد کرتے آرہے ہیں اس سلسلے میں حسین بن محمد دیار بکری اپنی کتاب ''تاریخ الخمیس'' میں یوں لکھتے ہیں:

''ولا یزال أھل الاسلام یحتفلون بشھر مولدہ علیہ السلام ویعملون الولائم ویتصدقون في لیالیہ بأنواع الصدقات ویظھرون السرور ویزیدون في المبرات و یعتنون بقراءۃ مولدہ الکریم ویظھر علیھم من برکاتہ کل فضل عمیم''(۱(

)۱ (حسین بن محمد بن حسن دیار بکری، تاریخ الخمیس جلد ا ص ۲۲۳ طبع بیروت.

دنیا کے مسلمان ہمیشہ سے پیغمبر اکرمؐ کی ولادت کے مہینے میں جشن کی محفلیں منعقد کرتے ہیں اور لوگوں کو کھانا کھلاتے ہیں اس مہینے کی راتوں میں طرح طرح کے صدقے دیتے ہیں اور خوشی کا اظہار کرتے ہیں اور بہت زیادہ نیکیاں انجام دیتے ہیں وہ لوگ بڑے اہتمام کے ساتھ ان کی ولادت کی مناسبت سے قصیدے پڑھتے ہیں اور ان کی برکت سے ان پر ہر قسم کے فضل ظاہر ہوتے ہیں.

اس بیان سے واضح ہو جاتا ہے کہ قرآن اور مسلمانوں کی نگاہ میں اولیائے خدا کی یاد منانا ایک پسندیدہ اور جائز عمل ہے اور ساتھ ہی ساتھ اولیائے خدا کی یاد منانا اور اسی طرح یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ وہ لوگ جو اولیائے خدا کی یاد منانے کو شرک سمجھتے ہیں ان کا یہ دعوی بے بنیاد اور بے دلیل ہے اور اسی کے ساتھ اولیاء خدا کی یاد منانے کو بدعت سمجھنے والے لوگوں کا نظریہ بھی باطل ہو جاتا ہے کیونکہ یہ فعل اس وقت بدعت قرار پاتا جب اس عمل کا جائز ہونا، خصوصی یا عمومی طور پر قرآن وسنت سے ثابت نہ ہوتا جبکہ ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن مجید میں کلی طور پر اس مسئلہ کا حکم موجود ہے اور مسلمانوں کی سیرت میں بھی اس کے نقوش ملتے ہیں.

اسی طرح یہ محفلیں خدا کے نیک بندوں کو خدا کی مخلوق اور اس کا محتاج سمجھتے ہوئے صرف ان کے احترام کی خاطر منعقد کی جاتی ہیں.

اس اعتبار سے یہ عمل توحید سے مکمل طور پر مطابقت رکھتا ہے. اور یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ وہ لوگ جو اولیاے خدا کی یاد منانے کو شرک سمجھتے ہیں ان کا یہ دعوی بے بنیاد اور بے دلیل ہے۔

ستائیسواں سوال

شیعہ پانچ نمازوں کو تین اوقات میں کیوں پڑھتے ہیں؟

جواب: بہتر ہے کہ اس بحث کی وضاحت کے لئے سب سے پہلے اس بارے میں فقہاء کے نظریات بیان کر دیئے جائیں:

۱۔ سارے اسلامی فرقے اس مسئلہ پر متفق ہیں کہ میدان ''عرفات'' میں ظہر کے وقت نماز ظہر اور نماز عصر کو اکھٹا اور بغیر فاصلے کے پڑھا جا سکتا ہے اسی طرح ''مزدلفہ'' میں عشا کے وقت نماز مغرب اور عشا کو ایک ساتھ پڑھنا جائز ہے.

۲۔ حنفی فرقہ کا کہنا ہے کہ: نماز ظہر و عصر اور نماز مغرب و عشاء کو اکھٹا ایک وقت میں پڑھنا صرف دو ہی مقامات ''میدان عرفات'' اور ''مزدلفہ'' میں جائز ہے اور باقی جگہوں پر اس طرح ایک ساتھ نمازیں نہ پڑھی جائیں.

۳۔ حنبلی، مالکی اور شافعی فرقوں کا کہنا ہے کہ : نماز ظہر و عصر اور نماز مغرب و عشاء کو ان گزشتہ دو مقامات کے علاوہ سفر کی حالت میں بھی ایک ساتھ ادا کیا جاسکتا ہے ان فرقوں میں سے کچھ لوگ بعض اضطراری موقعوں جیسے بارش کے وقت یا نمازی کے بیمار ہونے پر یا پھر دشمن کے ڈر سے ان نمازوں کو ساتھ میں پڑھنا جائز قرار دیتے ہیں(۱(

۴۔ شیعہ یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ نماز ظہر و عصر اور اسی طرح نماز مغرب و عشاء کے لئے ایک ''خاص وقت'' ہے اور ایک ''مشترک وقت :''

الف: نماز ظہر کا خاص وقت شرعی ظہر (زوال آفتاب) سے لیکر اتنی دیر تک ہے جس میں چار رکعت نماز پڑھی جاسکے.

ب: نماز عصر کا مخصوص وقت وہ ہے کہ جب غروب آفتاب میں اتنا وقت باقی بچا ہو کہ اس میں چار رکعت نماز پڑھی جاسکے.

ج: نماز ظہر و عصر کا مشترک وقت نماز ظہر کے مخصوص وقت کے ختم ہونے اور نماز عصر کے مخصوص وقت کے شروع ہونے تک ہے.

شیعہ یہ کہتے ہیں کہ ہم ان تمام مشترک اوقات میں نماز ظہر و عصر کو اکٹھا اور فاصلے کے بغیر پڑھ سکتے ہیں.

لیکن اہل سنت کہتے ہیں: کہ نماز ظہر کا مخصوص وقت، شرعی ظہر (زوال آفتاب) سے لیکر اس وقت تک ہے جب ہر چیز کا سایہ اس کے برابر ہو جائے اس وقت میں نماز عصر نہیں پڑھی جاسکتی اور اس کے بعد سے لے کر غروب آفتاب تک نماز عصر کا مخصوص وقت ہے اس وقت میں نماز ظہر نہیں پڑھی جاسکتی.

د: نماز مغرب کا مخصوص وقت شرعی مغرب کی ابتدا سے لے کر اس وقت تک ہے

)۱''(الفقہ علی المذاھب الاربعہ'' کتاب الصلوۃ الجمع بین الصلاتین تقدیماً وتاخیراً، سے اقتباس

کہ جس میں تین رکعت نماز پڑھی جاسکتی ہے. اس وقت میں صرف نماز مغرب ہی پڑھی جاسکتی ہے.

ھ: نماز عشاء کا مخصوص وقت یہ ہے کہ جب آدھی رات میں صرف اتنا وقت رہ جائے کہ اس میں چار رکعت نماز پڑھی جاسکے تو اس کو تاہ وقت میں صرف نماز عشاء ہی پڑھی جائے گی۔

و: مغرب و عشاء کی نمازوں کا مشترک وقت نماز مغرب کے مخصوص وقت کے ختم ہونے سے لے کر نماز عشاء کے مخصوص وقت تک ہے.

شیعہ یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ اس مشترک وقت کے اندر مغرب و عشاء کی نمازیں ایک ساتھ اور بغیر فاصلے کے ادا کی جاسکتی ہیں لیکن اہل سنت یہ کہتے ہیں کہ نماز مغرب کا مخصوص وقت غروب آفتاب سے لے کر مغرب کی سرخی زائل ہونے تک ہے اور اس وقت میں نماز عشاء نہیں پڑھی جاسکتی پھر مغرب کی سرخی کے زائل ہونے سے لیکر آدھی رات تک نماز عشاء کا خاص وقت ہے اور اس وقت میں نماز مغرب ادا نہیں کی جاسکتی.

نتیجہ: یہ نکلتا ہے کہ شیعوں کے نظریئے کے مطابق شرعی ظہر کا وقت آجانے پر نماز ظہر بجالانے کے بعد بلا فاصلہ نماز عصر ادا کر سکتے ہیں نماز ظہر کو اس وقت نہ پڑھ کر نماز عصر کے خاص وقت تک پڑھتے ہیں۔ اس طرح کہ نماز ظہر کو نماز عصر کے خاص وقت کے پہنچنے سے پہلے ختم کر دیں اور اس کے بعد نماز عصر پڑھ لیں اس طرح نماز ظہر و عصر کو جمع کیا جاسکتا ہے اگرچہ مستحب یہ ہے کہ نماز ظہر کو زوال کے بعد ادا کیا جائے اور نماز عصر کو اس وقت ادا کیا جائے کہ جب ہر چیز کا سایہ اس کے برابر ہو جائے.

اسی طرح شرعی مغرب کے وقت نماز مغرب کے بجالانے کے بعد بلا فاصلہ نماز عشا پڑھ سکتے ہیں یا پھر اگر چاہیں تو نماز مغرب کو نماز عشاء کے خاص وقت

کے قریب پڑھیں وہ اس طرح کہ نماز مغرب کو نماز عشاء کے خاص وقت کے پہنچنے سے پہلے ختم کر دیں اور اس کے بعد نماز عشاء پڑھ لیں اس طرح نماز مغرب وعشاء کو ساتھ میں پڑھا جاسکتا ہے. اگرچہ مستحب یہ ہے کہ نماز مغرب کو شرعی مغرب کے بعد ادا کیا جائے اور نماز عشاء کو مغرب کی سرخی کے زائل ہو جانے کے بعد بجالایا جائے یہ شیعوں کو نظریہ تھا.

لیکن اہل سنت کہتے ہیں کہ نماز ظہر وعصر یا مغرب وعشاء کو کسی بھی جگہ اور کسی بھی وقت میں ایک ساتھ ادا کرنا صحیح نہیں ہے اس اعتبار سے بحث اس میں ہے کہ کیا ہر جگہ اور ہر وقت میں دو نمازیں ایک ساتھ پڑھی جاسکتی ہیں ٹھیک اسی طرح جیسے میدان عرفہ اور مزدلفہ میں دو نمازوں کو ایک ساتھ ایک ہی وقت میں پڑھا جاتا ہے.

۵۔ سارے مسلمان اس بات پر متفق ہیں کہ پیغمبر اکرمؐ نے دو نمازیں ایک ساتھ پڑھی تھیں لیکن اس روایت کی تفسیر میں دو نظریئے پائے جاتے ہیں:

الف: شیعہ کہتے ہیں کہ اس روایت سے مراد یہ ہے کہ نماز ظہر کے ابتدائی وقت میں ظہر کی نماز ادا کرنے کے بعد نماز عصر کو بجالایا جاسکتا ہے اور اسی طرح نماز مغرب کے ابتدائی وقت میں مغرب کی نماز ادا کرنے کے بعد نماز عشا کو پڑھا جاسکتا ہے اور یہ مسئلہ کسی خاص وقت اور کسی خاص جگہ یا خاص حالات سے مخصوص نہیں ہے بلکہ ہر جگہ اور ہر وقت میں ایک ساتھ دو نمازیں ادا کی جاسکتی ہیں.

ب: اہل سنت کہتے ہیں مذکورہ روایت سے مراد یہ ہے کہ نماز ظہر کو اس کے آخری وقت میں اور نماز عصر کو اس کے اول وقت میں پڑھا جائے اور اسی طرح نماز مغرب کو اس کے آخری وقت میں اور نماز عشاء کو اس کے اول وقت میں پڑھا جائے.

اب ہم اس مسئلے کی وضاحت کے لئے ان روایات کی تحقیق کر کے یہ ثابت کریں گے کہ ان روایات میں دو نمازوں کو جمع کرنے سے وہی مراد ہے جو شیعہ کہتے ہیں. یعنی دو نمازوں کو ایک ہی نماز کے وقت میں پڑھا جاسکتا ہے اور یہ مراد نہیں ہے کہ ایک نماز کو اس کے آخری وقت میں اور دوسری نماز کو اس کے اول وقت میں پڑھا جائے:

روایات میں دو نمازوں کے ایک ہی ساتھ پڑھنے کا تذکرہ

۱۔ احمد ابن حنبل نے اپنے کتاب مسند میں جابر بن زید سے روایت کی ہے

أخبرني جابر بن زيد أنه سمع ابن عباس يقول: صلّيت مع رسول اللهﷺ ثمانيًا جميعًا، وسبعًا جميعًا قال قلت له يا أبا الشعثاء أظنّه أخّر الظهر وعجّل العصر وأخّر المغرب وعجّل العشاء قال وأنا أظن ذلك. (۱(

)۱(مسند احمد ابن حنبل، جلد ۱ ص ۲۲۱

جابر بن زید کا بیان ہے کہ انہوں نے ابن عباس سے سنا ہے کہ وہ کہہ رہے تھے: میں نے پیغمبر اکرمؐ کے ساتھ آٹھ رکعت نماز (ظہر وعصر) اور سات رکعت نماز (مغرب وعشاء) کو ایک ساتھ پڑھا ہے ابن عباس کہتے ہیں کہ میں نے ابو شعثاء سے کہا: میرا یہ گمان ہے کہ رسول خداؐ نے نماز ظہر کو تاخیر سے پڑھا ہے اور نماز عصر کو جلد ادا کیا ہے اسی طرح نماز مغرب کو بھی تاخیر سے پڑھا ہے اور نماز عشاء کو جلدی ادا کیا ہے ابو شعثاء نے کہا میرا بھی یہی گمان ہے.

اس روایت سے اچھی طرح معلوم ہو جاتا ہے کہ پیغمبر اکرمؐ نے ظہر و عصر اور مغرب و عشاء کی نمازوں کو ایک ساتھ اور بغیر فاصلے کے پڑھا تھا.

۲۔ احمد ابن حنبل نے عبداللہ بن شقیق سے درج ذیل روایت نقل کی ہے:

''خطبنا ابن عباس یوماً بعد العصر حتی غربت
الشمس وبدت النجوم وعلق الناس ینادونہ
الصلاۃ وفي القوم رجل من بنی تمیم فجعل یقول:
الصلاۃ الصلاۃ: قال فغضب قال أتعلّمني بالسنۃ؟
شھدت رسول اللہ ﷺ جمع بین الظھر والعصر
والمغرب والعشاء. قال عبداللہ فوجدت في
نفسي من ذلک شیءًا فلقیت أباھریرۃ فسالتہ
فوافقہ''(۱(

)۱(مسند احمد، جلد ۱ ص ۲۵۱.

ایک دن عصر کے بعد ابن عباس نے ہمارے درمیان خطبہ دیا یہاں تک کہ آفتاب غروب ہو گیا اور ستارے چمکنے لگے اور لوگ نماز کی ندائیں دینے لگے ان میں سے بنی تمیم قبیلے کا ایک شخص ''نماز'' ''نماز'' کہنے لگا ابن عباس نے غصے میں کہا کیا تم مجھے سنت پیغمبر کی تعلیم دینا چاہتے ہو؟ میں نے خود رسول خداؐ کو ظہر و عصر اور مغرب و عشاء کی نمازوں کو ایک ساتھ پڑھتے دیکھا ہے عبداللہ نے کہا اس مسئلے سے متعلق میرے ذہن میں شک پیدا ہو گیا تو میں ابوہریرہ کے پاس گیا اور ان سے سوال کیا تو انہوں نے ابن عباس کی بات کی تائید کی.

اس حدیث میں دو صحابی ''عبداللہ ابن عباس'' اور ''ابوہریرہ'' اس حقیقت کی گواہی دے رہے ہیں کہ پیغمبر اکرم ﷺ نے نماز ظہر و عصر اور مغرب و عشاء کو ایک ساتھ پڑھا ہے اور ابن عباس نے بھی پیغمبر اکرمؐ کے اس عمل کی پیروی کی ہے.

۳۔ مالک بن انس کا اپنی کتاب ''موطأ'' میں بیان ہے:

صلّیٰ رسول اللہ ﷺ الظھر والعصر جمیعًا والمغرب والعشاء جمیعًا في غیر خوف ولا سفر (۱(

)۱(موطأ مالک، کتاب الصلوۃ طبع ۳ (بیروت) ص ۱۲۵ حدیث ۱۷۸ صحیح مسلم جلد ۲ ص ۱۵۱ طبع بیروت، باب الجمع بین الصلاتین فی الحضر.

رسول خدا ﷺ نے ظہر و عصر اور مغرب و عشاء کی نمازیں ایک ساتھ پڑھی تھیں جبکہ نہ تو کسی قسم کا خوف تھا اور نہ ہی آپؐ سفر میں تھے.

۴۔ مالک بن انس نے معاذ بن جبل سے یہ روایت نقل کی ہے:

فکان رسول اللہ ﷺ یجمع بین الظھر والعصر والمغرب والعشاء (۱(

رسول خداﷺ نماز ظہر عصر اور نماز مغرب وعشاء کو ایک ساتھ بجالاتے تھے.

۵۔مالک بن انس نے نافع سے اور انہوں نے عبداللہ بن عمر سے یوں روایت نقل کی ہے:

کان رسول اللہ ﷺ اِذا عجّل بہ السیر یجمع بین المغرب والعشاء.(۲(

جس وقت رسول خداؐ کو کوئی مسافت جلدی طے کرنی ہوتی تو وہ مغرب وعشاء کی نمازوں کو ایک ساتھ بجالاتے تھے.

۶۔مالک ابن انس نے ابوہریرہ سے یوں روایت نقل کی ہے:

)۱(موطامالک کتاب الصلوۃ صفحہ ۱۳۴ حدیث ۱۷۶ طبع ۳ بیروت سال طبع ۱۴۰۳ھ. صحیح مسلم طبع مصر جز ۲ صفحہ ۱۵۲.

)۲ (موطأمالک کتاب الصلوۃ ص ۱۲۵ حدیث ۱۷۷.

اِن رسول اللہ ﷺ کان یجمع بین الظہر والعصر في سفرہ الی تبوک(۱ (

پیغمبر اکرمؐ نے تبوک کے راستے میں ظہر وعصر کی نمازیں ایک ساتھ پڑھیں تھیں.

۷۔مالک نے اپنی کتاب موطأمیں نافع سے یوں روایت نقل کی ہے :

اِن عبداللہ بن عمر کان اِذا جمع الأمراء بین المغرب والعشاء في المطر جمع معھم(۲(

جب بھی بارش کے دوران حکام مغرب اور عشاء کو اکھٹا پڑھتے تھے تو عبداللہ بن عمر بھی ان کے ساتھ اپنی نمازوں کو ایک ساتھ پڑھ لیا کرتے تھے.

۸۔مالک ابن انس نے علی بن حسین سے یوں نقل کیا ہے:

کان رسول اللہ ﷺ اِذا أراد أن یسیر یومہ جمع بین الظہر والعصر واِذا أراد أن یسیر لیلہ جمع بین المغرب والعشاء(۳(

)۱(موطأمالک کتاب الصلوۃ ص ۱۲۴ حدیث ۱۷۵.

)۲ (موطأمالک کتاب الصلوۃ ص ۱۲۵ حدیث ۱۷۹.

)۳(موطأمالک، کتاب الصلوۃ ص ۱۲۵ حدیث ۱۸۱.

پیغمبر اکرمؐ جب دن میں سفر کرنا چاہتے تھے تو ظہر اور عصر کی نمازوں کو اکھٹا ادا کر لیا کرتے تھے اور جب رات میں سفر کرنا ہوتا تھا تو مغرب اور عشاء کی نمازوں کو ایک ساتھ پڑھتے تھے.

۹۔محمد زرقانی نے موطأ کی شرح میں ابن شغثا سے یوں روایت نقل کی ہے

اِنّ ابن عباس صلّیٰ بالبصرۃ الظہر والعصر لیس بینھما شيء والمغرب والعشاء لیس بینھما شيء(۱(

بے شک ابن عباس نے بصرہ میں نماز ظہر وعصر کو ایک ساتھ اور بغیر فاصلے کے پڑھا تھا اور اسی طرح نماز مغرب وعشاء کو بھی اکھٹا اور بغیر فاصلے کے بجالائے تھے

۱۰۔زرقانی نے طبرانی سے اور انھوں نے ابن مسعود سے نقل کیا ہے :

جمع النبيّ ﷺ بين الظهر والعصر وبين المغرب والعشاء فقيل له في ذلك فقال: صنعت هذا لئلا تحرج أمتي (۲(

پیغمبر اکرمؐ نے جب نماز ظہر و عصر اور نماز مغرب و عشاء کو ایک ساتھ پڑھا تو آنحضرتؐ سے اس کے بارے میں پوچھا گیا

)۱(موطائے زرقانی کی شرح، جزاول باب الجمع بین الصلاتین فی الحضر والسفر ص ۲۹۴ طبع مصر.

)۲(گزشتہ حوالہ.

جواب میں آپؐ نے فرمایا کہ میں نے اس عمل کو اس لئے انجام دیا ہے تاکہ میری امت مشقت میں نہ پڑ جائے.

۱۱۔ مسلم بن حجاج نے ابوزبیر سے اور انہوں نے سعید بن جبیر سے اور انہوں نے ابن عباس سے یوں روایت نقل کی ہے:

صلّیٰ رسول الله ﷺ بين الظهر والعصر جميعًا بالمدينة في غير خوف ولا سفر (۱(

پیغمبر اکرمؐ نے مدینہ منورہ میں بغیر خوف و سفر کے نماز ظہر و عصر کو ایک ساتھ پڑھا تھا.

اس کے بعد ابن عباس نے پیغمبر اکرمؐ کے اس عمل کے بارے میں کہا کہ:

آنحضرت چاہتے تھے کہ ان کی امت میں سے کوئی بھی شخص مشقت میں نہ پڑنے پائے (۲(

۱۲۔ مسلم نے اپنی کتاب صحیح میں سعید بن جبیر سے اور انہوں نے ابن عباس سے یوں روایت نقل کی ہے:

جمع رسول الله ﷺ بين الظهر والعصر والمغرب والعشاء في المدينة من غير خوف

)۱(صحیح مسلم جزء ۲ ص ۱۵۱ باب الجمع بین الصلاتین فی الحضر، طبع مصر.

)۲(یہ مطلب گزشتہ کتاب میں اسی حدیث کے ذیل میں مذکور ہے.

ولا مطر. (۱(

پیغمبر اکرمؐ نے مدینہ منورہ میں بغیر خوف اور بارش کے نماز ظہر و عصر اور نماز مغرب و عشاء کو اکھٹا پڑھا تھا.

اس وقت سعید ابن جبیر نے ابن عباس سے پوچھا کہ پیغمبر اکرمؐ نے اس طرح کیوں کیا؟ تو ابن عباس نے کہا آنحضرتؐ اپنی امت کو زحمت میں نہیں ڈالنا چاہتے تھے. (۲(

۱۳۔ ابوعبداللہ بخاری نے اپنی کتاب صحیح بخاری میں اس سلسلے میں "باب تأخیر الظہر إلی العصر" کے نام سے ایک مستقل باب قرار دیا ہے. (۳(

یہ خود عنوان اس بات کا بہترین گواہ ہے کہ نماز ظہر میں تاخیر کر کے اسے نماز عصر کے وقت میں اکھٹا بجالایا جاسکتا ہے اس کے بعد بخاری نے اسی مذکورہ باب میں درج ذیل روایت نقل کی ہے:

إنّ النبيّ ﷺ صلّیٰ بالمدينة سبعًا وثمانيًا الظهر والعصر والمغرب والعشاء (۴(

)۱(گزشتہ حوالہ، صفحہ نمبر ۱۵۲.

)۲(یہ مطلب گزشتہ کتاب کے صفحہ ص ۱۵۲ میں اسی حدیث کے ذیل میں مذکور ہے.

)۳(صحیح بخاری جزاول ص ۱۱۰ کتاب الصلوۃ باب تاخیر الظہر الی العصر طبع مصر نسخہ امیریہ ۱۳۱۴ ھ

)۴ (گزشتہ حوالہ.

بہ تحقیق پیغمبر اکرمؐ مدینہ میں سات رکعت (نماز مغرب وعشاء) اور آٹھ رکعت (نماز ظہر وعصر) پڑھی ہیں.

اس روایت سے اچھی طرح معلوم ہو جاتا ہے کہ جس طرح نماز ظہر میں تاخیر کر کے اسے نماز عصر کے وقت میں نماز عصر کے ساتھ بجالایا جاسکتا ہے، اسی طرح سیاق حدیث میں موجود قرینہ اور پیغمبر اکرمؐ کی سیرت سے سمجھ میں آتا ہے کہ نماز مغرب میں بھی دیر کر کے اسے نماز عشاء کے وقت میں نماز عشاء کے ساتھ بجالایا جاسکتا ہے.

۱۴۔ بخاری نے اپنی کتاب صحیح میں ایک اور مقام پر لکھا ہے:

قال ابن عمر و أبو أيوب وابن عباس رضي الله عنهم صلّى النبيّ ﷺ المغرب والعشاء (۱(

عبداللہ بن عمر وابوایوب انصاری اور عبداللہ بن عباس نے کہا ہے کہ: پیغمبر خداؐ نے مغرب اور عشاء کی نمازوں کو ایک ساتھ پڑھا ہے.

بخاری اس حدیث سے مسلم طور پر یہ سمجھانا چاہتے تھے کہ پیغمبر اکرمؐ نے نماز مغرب وعشاء کو ایک ساتھ پڑھا تھا کیونکہ یہ تو یقینی ہے کہ بخاری ہر گز اس حدیث کے ذریعے حضورؐ کے نمازی ہونے کو ثابت نہیں کرنا چاہتے تھے.

)۱(صحیح بخاری جزاول کتاب الصلوۃ باب ذکر العشاء ص ۱۱۳ طبع مصر ۱۳۱۴ ھ

۱۵۔ مسلم بن حجاج نے اپنی کتاب صحیح میں بیان کیا ہے:

قال رجل لابن عباس الصلاة فسكت ثم قال الصلاة فسكت ثم قال الصلاة فسكت ثم قال: لا أم لك أتعلمنا بالصلوٰة وكنّا نجمع بين الصلاتين على عهد رسول الله ﷺ (۱(

ایک شخص نے ابن عباس سے کہا: ''نماز'' تو ابن عباس نے کچھ نہ کہا اس شخص نے پھر کہا ''نماز'' پھر بھی ابن عباس نے اسے کوئی جواب نہ دیا تو اس شخص نے پھر کہا ''نماز'' لیکن ابن عباس نے پھر کوئی جواب نہیں دیا جب اس شخص نے چوتھی مرتبہ کہا: ''نماز'' تب ابن عباس بولے اوبے اصل! تم ہمیں نماز کی تعلیم دینا چاہتے ہو؟ جبکہ ہم پیغمبر خداؐ کے زمانے میں دو نمازوں کو ایک ساتھ بجالایا کرتے تھے.

۱۶۔ مسلم نے یوں روایت نقل کی ہے:

إنّ رسول الله ﷺ جمع بين الصلاة في سفرة سافرها في غزوة تبوك فجمع بين الظهر والعصر والمغرب والعشاء. قال سعيد فقلت: لابن عباس:

)۱(صحیح مسلم جز ۲ ص ۱۵۳ باب الجمع بین الصلاتین فی الحضر

ماحمله على ذلك؟ قال أراد أن لا يحرج أمته (۱(

پیغمبر خداؐ نے غزوہ تبوک کے سفر میں نمازوں کو جمع کر کے نماز ظہر وعصر اور مغرب عشاء کو ایک ساتھ پڑھا تھا سعید بن جبیر نے کہا کہ میں نے ابن عباس

سے آنحضرتؐ کے اس عمل کا سبب دریافت کیا تو انہوں نے جواب دیا آنحضرت چاہتے تھے کہ ان کی امت مشقت میں نہ پڑے.

۱۷۔ مسلم ابن حجاج نے معاذ سے اس طرح نقل کیا ہے:

خرجنا مع رسول اللہ ﷺ في غزوة تبوک فکان یُصلّي الظهر والعصر جمیعًا والمغرب والعشاء جمیعًا. (۲(

ہم پیغمبر خداؐ کے ساتھ غزوہ تبوک کی طرف نکلے تو آنحضرتؐ نے نماز ظہر و عصر اور نماز مغرب و عشاء کو ایک ساتھ پڑھا.

۱۸۔ مالک ابن انس کا اپنی کتاب ''الموطأ'' میں بیان ہے کہ:

عن ابن شهاب أنّہ سأل سالم بن عبد اللہ: هل یجمع بین الظهر والعصر في السفر؟ فقال نعم

)۱(صحیح مسلم جز ۲ ص ۱۵۱ طبع مصر

)۲(گزشتہ حوالہ

لا بأس بذلک، ألم تر الی الصلاة الناس بعرفة؟ (۱(

ابن شہاب نے سالم بن عبد اللہ سے سوال کیا کہ کیا حالت سفر میں نماز ظہر و عصر کو ایک ساتھ بجالایا جاسکتا تھا؟ سالم بن عبد اللہ نے جواب دیا ہاں اس کام میں کوئی حرج نہیں ہے کیا تم نے عرفہ کے دن لوگوں کو نماز پڑھتے نہیں دیکھا ہے؟

یہاں پر اس نکتے کا ذکر ضروری ہے کہ عرفہ کے دن نماز ظہر و عصر کو نماز ظہر کے وقت میں بجالانے کو سب مسلمان جائز سمجھتے ہیں اس مقام پر سالم بن عبد اللہ نے کہا تھا کہ جیسے لوگ عرفہ کے دن دو نمازوں کو اکھٹا پڑھتے ہیں اسی طرح عام دنوں میں بھی دو نمازوں کو ایک ساتھ پڑھا جاسکتا ہے.

۱۹۔ متقی ہندی اپنی کتاب ''کنز العمال'' میں لکھتے ہیں:

قال عبد اللہ: جمع لنا رسول اللہ ﷺ مقیمًا غیر مسافر بین الظهر والعصر والمغرب والعشاء فقال رجل لابن عمر: لم تری النبيّ ﷺ فعل ذلک؟ قال: لِأن لا یحرج أمته ان جمع رجل. (۲(

عبد اللہ ابن عمر نے کہا: کہ پیغمبر خداؐ نے بغیر سفر کے نماز ظہر

)۱(موطأ مالک ص ۱۲۵ حدیث ۱۸۰ طبع ۳، بیروت.

)۲(کنز العمال کتاب الصلوة، باب الرابع فی صلاة المسافر باب جمع جلد ۸ ص ۲۴۶ طبع ۱ حلب ۱۳۹۱ ھ

وعصر اور مغرب وعشاء کو اکھٹا پڑھا تھا ایک شخص نے ابن عمر سے سوال کیا کہ پیغمبر اکرمؐ نے ایسا کیوں کیا؟ تو ابن عمر نے جواب دیا کہ آنحضرتؐ اپنی امت کو مشقت میں نہیں ڈالنا چاہتے تھے تاکہ اگر کوئی شخص چاہے تو دو نمازوں کو ایک ساتھ بجالائے.

۲۰۔ اسی طرح کنز العمال میں یہ روایت بھی موجود ہے:

عن جابر أنّ النبيّ ﷺ جمع بین الظهر والعصر بأذان واقامتین (۱(

نبی اکرمؐ نے ظہر و عصر کی نمازوں کو اکھٹا ایک اذان اور دو اقامتوں کے ساتھ پڑھا تھا.

۲۱۔ کنزالعمال میں درج ذیل روایت بھی موجود ہے:

عن جابر أنّ رسول اللہ ﷺ غربت لہ الشمس بمکۃ فجمع بینھما بسرف (۲(

جابر بن عبداللہ سے منقول ہے کہ مکہ میں ایک دفعہ جب آفتاب غروب ہو گیا تو رسول خداؐ نے ''سرف'' (۳) کے مقام پر نماز مغرب وعشاء کو اکھٹا پڑھا تھا.

)۱(کنزالعمال کتاب الصلوۃ، باب الرابع فی صلوۃ المسافر باب جمع جلد ۸ ص ۲۴۷ طبع ا حلب.

)۲ (گزشتہ حوالہ.

)۳(سرف مکہ سے نو میل کے فاصلے پر واقع مقام کا نام ہے (یہ بات کنزالعمال سے اسی حدیث کے ذیل سے ماخوذ ہے(

۲۲۔ کنزالعمال میں ابن عباس سے یوں منقول ہے:

جمع رسول اللہ ﷺ بین الظھر والعصر والمغرب والعشاء بالمدینۃ في غیر سفر ولا مطر قال: قلت لابن عباس: لم تراہ فعل ذلک؟ قال: أراد التوسعۃ علیٰ أمتہ (۱(

پیغمبر خداؐ نے مدینہ میں بغیر سفر اور بارش کے نماز ظہر وعصر اور مغرب وعشاء کو اکھٹا پڑھا تھا. راوی کہتا ہے کہ میں نے ابن عباس سے پوچھا آنحضرتؐ کے اس عمل کے سلسلے میں آپ کا کیا نظریہ ہے؟ تو ابن عباس نے جواب دیا آنحضرتؐ اپنی امت کے لئے سہولت اور آسانی قرار دینا چاہتے تھے .

نتیجہ:

اب ہم گزشتہ روایات کی روشنی میں دو نمازوں کو جمع کرنے کے سلسلے میں شیعوں کے نظریہ کے صحیح ہونے پر چند دلیلیں پیش کریں گے:

ا۔ دو نمازوں کو ایک وقت میں ایک ساتھ بجالانے کی اجازت نمازیوں کی سہولت اور انہیں مشقت سے بچانے کے لئے دی گئی ہے.

متعدد روایات میں اس حقیقت کو بیان کیا گیا ہے کہ اگر نماز ظہر وعصر یا مغرب و

)۱(کنزالعمال، کتاب الصلوۃ، الباب الرابع، باب جمع جلد ۸.

عشاء کو ایک وقت میں بجالانا جائز نہ ہوتا تو یہ امر مسلمانوں کے لئے زحمت ومشقت کا باعث بنتا اسی وجہ سے پیغمبر اسلامؐ نے مسلمانوں کی سہولت اور آسانی کے لئے دو نمازوں کو ایک وقت میں بجالانے کو جائز قرار دیا ہے (اس سلسلے میں دسویں، سولہویں، انیسویں، اور بائیسویں حدیث کا مطالعہ فرمایئے(

واضح ہے کہ اگر ان روایات سے یہ مراد ہو کہ نماز ظہر کو اسکے آخری وقت (جب ہر چیز کا سایہ اسکے برابر ہو جائے) تک تاخیر کر کے پڑھا جائے اور نماز عصر کو اسکے اول وقت میں بجالایا جائے اس طرح ہر دو نمازیں ایک ساتھ مگر اپنے اوقات ہی میں پڑھی جائیں(اہل سنت حضرات ان روایات سے یہی مراد لیتے ہیں) تو ایسے کام میں کسی طرح کی سہولت نہیں ہو گی بلکہ یہ کام مزید مشقت کا باعث بنے گا جبکہ دو نمازوں کو ایک ساتھ بجالانے کی اجازت کا یہ مقصد تھا کہ نمازیوں کیلئے سہولت ہو.

اس بیان سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ گزشتہ روایات سے مراد یہ ہے کہ دو نمازوں کو ان کے مشترک وقت کے ہر حصے میں بجالایا جاسکتا ہے اب نماز گزار کو

اختیار ہے کہ وہ مشترک وقت کے ابتدائی حصے میں نماز پڑھے یا اس کے آخری حصے میں اور ان روایات سے یہ مراد نہیں ہے کہ ایک نماز کو اس کے آخری وقت میں اور دوسری کو اس کے اول وقت میں ادا کیا جائے.

۲۔ روز عرفہ دو نمازوں کو اکھٹا پڑھنے کے حکم سے باقی دنوں میں نمازوں کو ایک ساتھ پڑھنے کا جواز معلوم ہوتا ہے تمام اسلامی فرقوں کے نزدیک عرفہ کے دن ظہر و عصر کی نمازوں کو ایک وقت میں بجالانا جائز ہے (۱(

مزید براں گزشتہ روایات میں سے بعض اس بات کی گواہ ہیں کہ میدان عرفات کی طرح باقی مقامات پر بھی نمازوں کو اکھٹا بجالایا جاسکتا ہے اب اس اعتبار سے روز عرفہ اور باقی عام دنوں کے درمیان یا عرفات کی سرزمین اور باقی عام جگہوں میں کوئی فرق نہیں ہے اس سلسلہ میں اٹھارویں حدیث کا مطالعہ فرمائیں.

لہذا جس طرح مسلمانوں کے متفقہ نظریئے کے مطابق عرفہ میں ظہر و عصر کی نمازوں کو ظہر کے وقت پر ایک ساتھ پڑھا جاتا ہے اسی طرح عرفہ کے علاوہ بھی ان نمازوں کو ظہر کے وقت اکھٹا پڑھنا بالکل صحیح ہے.

۳۔ سفر کی حالت میں دو نمازوں کو اکھٹا پڑھنے کے حکم سے غیر سفر میں بھی نمازوں کے ایک ساتھ بجالانے کا جواز معلوم ہوتا ہے. ایک طرف سے حنبلی، مالکی، اور شافعی یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ حالت سفر میں دو نمازوں کو اکھٹا بجالایا جاسکتا ہے اور دوسری طرف گزشتہ روایات صراحت کے ساتھ کہہ رہی ہیں کہ اس اعتبار سے سفر اور غیر سفر میں کوئی فرق نہیں ہے کیونکہ پیغمبر اکرمؐ نے دونوں حالتوں میں نمازوں کو اکھٹا پڑھا تھا.

)اس سلسلے میں تیسری، گیارہویں، تیرہویں، اور بائیسویں حدیث کا مطالعہ فرمائیں(

اس بنیاد پر (شیعوں کے نظریئے کے مطابق) جس طرح حالت سفر میں دو

)۱(الفقہ علی المذاھب الاربعہ، کتاب الصلوۃ، الجمع بین الصلوٰتین تقدیما وتاخیرا.

نمازوں کو اکھٹا بجالانا صحیح ہے اسی طرح عام حالات میں بھی دو نمازوں کو اکھٹا پڑھا جاسکتا ہے.

۴۔ اضطراری حالت میں دو نمازوں کے اکھٹا پڑھنے کے حکم سے عام حالت میں بھی نمازوں کے اکھٹا پڑھنے کا جواز معلوم ہو جاتا ہے. اہل سنت کی صحیح اور مسند کتابوں میں سے بہت سی روایات اس حقیقت کی گواہی دیتی ہیں کہ پیغمبر اکرمؐ اور ان کے اصحاب نے چند اضطراری موقعوں پر جیسے بارش کے وقت یا دشمن کے خوف سے یا بیماری کی حالت میں نمازوں کو ایک ساتھ اور ایک ہی وقت میں (ٹھیک اسی طرح جیسے شیعہ کہتے ہیں) پڑھا تھا اور اسی وجہ سے مختلف اسلامی فرقوں کے فقہاء نے بعض اضطراری حالات میں دو نمازوں کو ایک ساتھ پڑھنا جائز قرار دیا ہے جب کہ گزشتہ روایات اس بات کو وضاحت کے ساتھ بیان کر رہی ہیں کہ اس سلسلے میں اضطراری اور عام حالت میں کوئی فرق نہیں ہے. اور پیغمبر اکرمؐ نے دونوں حالتوں میں اپنی نمازوں کو ایک ساتھ پڑھا ہے.

اس سلسلے میں تیسری، گیارہویں، اور بارہویں، اور بائیسویں روایت کا مطالعہ کیجئے

۵۔ اصحاب پیغمبرؐ کی روش سے دو نمازوں کے ایک ساتھ بجالانے کا جواز معلوم ہوتا ہے.

گزشتہ روایات میں یہ نکتہ موجود ہے کہ آنحضرتؐ کے بہت سے اصحاب دو نمازوں کو ایک وقت میں بجالاتے تھے جیسے کہ عبداللہ ابن عباس نے نماز

مغرب میں اتنی دیر کردی تھی کہ اندھیرا چھا گیا تھا اور آسمان پر ستارے چمکنے لگے تھے اور لوگوں نے نماز کی صدائیں دینا شروع کردی تھیں مگر ابن عباس نے ان کی طرف توجہ نہیں کی تھی سرانجام جب رات کا کچھ حصہ گزر گیا تب انہوں نے نماز مغرب وعشاء پڑھی تھی. اور اعتراض کرنے والوں کو یہ جواب دیا تھا: میں نے پیغمبر اسلامؐ کو اسی طرح نماز پڑھتے دیکھا ہے نیز ابوہریرہ نے بھی ابن عباس کی اس بات کی تائید کی تھی (اس سلسلے میں دوسری، ساتویں، نویں، اور پندہویں روایت کا مطالعہ فرمائیں(

گزشتہ روایات کی روشنی میں اب اس بات میں کوئی شک نہیں رہ جاتا کہ پیغمبر اسلامؐ کے صحابی ابن عباس نے شیعوں کی طرح دو نمازوں کو ایک وقت میں پڑھا تھا.

۶۔ پیغمبر اسلامؐ کی سیرت سے دو نمازوں کو ایک ساتھ بجالانے کا جواز معلوم ہوتا ہے. اکیسویں حدیث کی روشنی میں یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ نماز مغرب کے وقت پیغمبر اکرمؐ مکہ مکرمہ میں تشریف فرما تھے لیکن آنحضرتؐ نے نماز مغرب میں تاخیر کی تھی اور ''سرف'' نامی علاقہ (جو مکہ سے نو میل کے فاصلے پر واقع تھا) میں پہنچ کر نماز مغرب وعشاء کو ایک ساتھ پڑھا تھا جب کہ یہ واضح ہے کہ اگر آنحضرت مکہ سے مغرب کے اول وقت میں چلے ہوں گے تو اس زمانے کی کم رفتار سواری کے ذریعے سفر کرنے کی وجہ سے یقیناً رات کا کافی حصہ گزر جانے کے بعد ہی سرف کے مقام تک پہنچے ہوں گے اسی وجہ سے حضورؐ نے مغرب وعشاء کی نمازوں کو ایک ساتھ پڑھا تھا اہل سنت حضرات کی صحیح اور مسند کتابوں سے منقول گزشتہ روایات شیعوں کے نظریئے (ظہر وعصر یا مغرب وعشاء کی نمازوں کو ہر وقت، ہر جگہ اور ہر طرح کی صورتحال میں ایک ساتھ پڑھنا جائز ہے) کے صحیح ہونے کی گواہی دیتی ہیں.

اٹھائیسواں سوال

شیعوں کی فقہ کے ماخذ کون سے ہیں؟

جواب: شیعہ، قرآن مجید اور سنت نبوی کی پیروی کرتے ہوئے احکام شرعی کو درج ذیل چار بنیادی مآخذ سے حاصل کرتے ہیں:

۱۔ کتاب خدا

۲۔ سنت

۳۔ اجماع

۴۔ عقل

مذکورہ ماخذ و منابع میں سے قرآن مجید اور سنت نبویؐ فقہ شیعہ کے بنیادی ترین ماخذ ہیں اب ہم یہاں ان دونوں کے سلسلے میں اختصار کیساتھ گفتگو کریں گے:

کتاب خدا؛ قرآن مجید

مکتب تشیع کے پیرو قرآن مجید کو اپنی فقہ کا محکم ترین منبع اور احکام الٰہی، کی شناخت کا معیار سمجھتے ہیں کیونکہ شیعوں کے ائمہ ۲۲۲ نے فقہی احکام کے حصول کے لئے قرآن مجید کو ایک محکم مرجع قرار دیا ہے اور یہ حکم دیا ہے کہ کسی بھی نظریئے کو قبول کرنے سے پہلے اسے قرآن مجید پر پرکھا جائے اگر وہ نظریہ قرآن سے مطابقت رکھتا ہو تو اسے قبول کر لیا جائے ورنہ اس نظریئے کو نہ مانا جائے.

اس سلسلے میں امام صادق۔ فرماتے ہیں:

وکل حدیث لا یوافق کتاب اللہ فھو زخرف.(۱(

ہر وہ کلام جو کتاب خدا سے مطابقت نہ رکھتا ہو وہ باطل ہے.

اسی طرح امام صادق۔ نے رسول خداؐ سے یوں نقل کیا ہے:

أیّھاالناس ماجائکم عنی یوافق کتاب اللہ فأنا قلتہ وماجاء کم یخالف کتاب اللہ فلم أقلہ (۲(

اے لوگو! ہر وہ کلام جو میری طرف سے تم تک پہنچے اگر وہ کتاب خدا کے مطابق ہو تو وہ میرا قول ہے لیکن اگر تم تک پہنچنے والا کلام کتاب خدا کا مخالف ہو تو وہ میرا قول نہیں ہے.

ان دو حدیثوں سے بخوبی معلوم ہو جاتا ہے کہ شیعوں کے ائمہ ۲۲۲ کی نگاہ میں احکام شرعی کو حاصل کرنے کے لئے کتاب خدا محکم ترین ماخذ شمار ہوتی ہے.

)۱(اصول کافی، جلد ۱، کتاب فضل العلم، باب الاخذ بالسنۃ وشواہد الکتاب، حدیث ۳.

)۲ (گذشتہ حوالہ حدیث ۵.

سنت

حضرت رسول اکرم ﷺ کا قول و فعل اور کسی کام کے سلسلے میں

آنحضرتؐ کی تائید کو سنت کہتے ہیں اسے شیعوں کی فقہ کا دوسرا ماخذ شمار کیا جاتا ہے سنت نبویؐ کو نقل کرنے والے ائمہ معصومین ۲۲۲ ہیں جو آنحضرتؐ کے علوم کے خزینہ دار ہیں.

البتہ نبی اکرمؐ کے چند دوسرے طریقوں سے نقل ہونے والے ارشادات کو بھی شیعہ قبول کرتے ہیں. یہاں پر ضروری ہے کہ ہم دو چیزوں کے متعلق بحث کریں:

سنت نبویؐ سے تمسک کی دلیلیں: شیعوں کے ائمہ ۲۲۲ نے اپنی پیروی کرنے والوں کو جس طرح قرآن مجید پر عمل کرنے کا حکم دیا ہے اسی طرح انہوں نے سنت نبوی کی پیروی کرنے کی بھی تاکید کی ہے اور ہمیشہ اپنے ارشادات میں ان دونوں سے تمسک اختیار کرنے کا حکم دیا ہے. امام صادق۔ فرماتے ہیں :

اِذا ورد علیکم حدیث فوجد تم لہ شاھداً من کتاب اللہ أو من قول رسول ﷺ والا فالذي جائکم بہ أولی بہ. (۱(

جب کوئی کلام تم تک پہنچے تو اگر تمہیں کتاب خدا یا سنت نبویؐ سے اس کی تائید حاصل ہو جائے تو اسے قبول کر لینا ورنہ وہ کلام

)۱(اصول کافی جلد ۱ کتاب فضل العلم، باب الاخذ بالسنہ و شواھد الکتاب حدیث ۲.

بیان کرنے والے ہی کو مبارک ہو.

اسی طرح امام محمد باقر۔ نے ایک جامع الشرائط فقیہ کے لئے سنت نبی اکرم سے تمسک کو اہم ترین شرط قرار دیتے ہوئے یوں فرمایا ہے:

اِنّ الفقیہ حق الفقیہ الزاھد في الدنیا والراغب في الآخرۃ المتمسک بسنۃ النبیّ ﷺ (۱(

بے شک حقیقی فقیہ وہ ہے جو دنیا سے رغبت نہ رکھتا ہو اور آخرت کا اشتیاق رکھتا ہو، نیز سنت نبویؐ سے تمسک رکھنے والا ہو.

ائمہ معصومین ۲۲۲ نے اس حد تک سنت نبویؐ کی تاکید فرمائی ہے کہ وہ کتاب خدا اور سنت نبوی کی مخالفت کو کفر کی اساس قرار دیتے ہیں اس سلسلے میں امام صادق۔ یوں فرماتے ہیں:

مَن خالف کتاب اللہ و سنۃ محمّد ﷺ فقد کفر. (۲(

جس شخص نے کتاب خدا اور سنت محمدیؐ کی مخالفت کی وہ کافر ہو گیا.

اس بیان سے واضح ہو جاتا ہے کہ شیعہ مسلمانوں کے بقیہ فرقوں کی بہ نسبت نبی اکرمؐ کی سنت کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں اور اسی طرح بعض لوگوں کا یہ نظریہ بھی باطل ہو جاتا ہے کہ شیعہ نبی اکرمؐ کی سنت سے بیگانہ اور دور ہیں.

)۱ (گذشتہ حوالہ حدیث ۸

)۲ (گذشتہ حوالہ حدیث ۶

احادیث اہل بیت ۲۲۲ سے تمسک کے دلائل

عترت پیغمبر کی احادیث کے سلسلے میں شیعوں کے نظریہ کی وضاحت کے لئے ضروری ہے کہ ہم ذیل کے دو موضوعات پر گفتگو کریں:

الف: ائمہ معصومین کی احادیث کی حقیقت.

ب: اہل بیت رسولؐ سے تمسک کے اہم اور ضروری ہونے کے دلائل. اب ہم یہاں ان دو موضوعات کے سلسلے میں مختصر طور پر تحقیقی گفتگو کریں گے:

عترت رسولؐ کی احادیث کی حقیقت

شیعوں کے نکتہ نظر سے فقط خداوند حکیم ہی انسانوں کے لئے شریعت قرار دینے اور قانون وضع کرنے کا حق رکھتا ہے اور اس کی طرف سے یہ شریعت اور قوانین پیغمبر اکرمؐ کے ذریعہ لوگوں تک پہنچتے ہیں. واضح ہے کہ نبی اکرمؐ خدا اور انسانوں کے درمیان وحی کے ذریعہ حاصل ہونے والی شریعت کے پہنچانے کے لئے واسطے کی ذمہ داری کو نبھاتے ہیں اس سے یہ واضح ہو جاتا ہے اگر شیعہ اہل بیت ۲۲۲ کی احادیث کو اپنی فقہ کے ماخذ میں شمار کرتے ہیں تو ہر گز اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اہل بیت ۲۲۲ کی احادیث سنت نبویؐ کے مقابلے میں کوئی مستقل حیثیت رکھتی ہیں بلکہ احادیث اہل بیت ۲۲۲ اس وجہ سے معتبر ہیں کہ وہ سنت نبویؐ کو بیان کرتی ہیں.

اس اعتبار سے ائمہ معصومین ۲۲۲ کبھی بھی اپنی طرف سے کوئی بات نہیں فرماتے بلکہ جو کچھ وہ فرماتے ہیں وہ در حقیقت سنت پیغمبرؐ ہی کی وضاحت ہوتی ہے یہاں پر ہم اس بات کو ثابت کرنے کے لئے ائمہ معصومین ۲۲۲ کی چند روایات پیش کریں گے :

۱۔امام صادق۔نے ایک شخص کے سوال کے جواب میں یوں فرمایا ہے :

مھما أجبتک فیہ بشیء فھو عن رسول اللہ ﷺ لسنا نقول برأینا من شیء.(۱(

اس سلسلے میں جو جواب میں نے تمہیں دیا ہے وہ رسول خداؐ کی طرف سے ہے ہم کبھی بھی اپنی طرف سے کچھ نہیں کہتے :اور ایک مقام پر یوں فرماتے ہیں :

حدیثی حدیث أبي، وحدیث أبي حدیث جدي وحدیث جدي حدیث الحسین وحدیث الحسین حدیث الحسن وحدیث الحسن حدیث أمیر المؤمنین، وحدیث أمیر المؤمنین حدیث رسول اللہ ﷺ وحدیث رسول اللہ قول اللہ عزّ وجلّ.(۲(

میری حدیث میرے والد (امام باقر۔) کی حدیث ہے،

)۱(جامع الاحادیث الشیعہ جلد ۱ ص ۱۲۹

)۲ (گذشتہ حوالہ ص ۱۲۷

اور میرے والد کی حدیث میرے دادا (امام زین العابدین۔) کی حدیث ہے اور میرے دادا کی حدیث امام حسین۔ کی حدیث ہے اور امام حسین۔ کی حدیث امام حسن۔ کی حدیث ہے اور امام حسن۔ کی حدیث امیر المومنین۔ کی حدیث ہے اور امیر المومنین۔ کی حدیث رسول خدا ﷺ کی حدیث ہے اور رسول خدا ﷺ کی حدیث خداوند متعال کا قول ہے.

۲۔امام محمد باقر۔نے جابر سے یوں فرمایا تھا:

حدثني أبي عن جدي رسول اللہ ﷺ عن جبرائیل۔ عن اللہ عزّ وجلّ وکلما أحدّثک بھذا الأسناد.(۱(

میرے پدر بزرگوار نے میرے دادا رسول خدا ﷺ سے اور انہوں نے جبرئیل سے اور انہوں نے خداوند عالم سے روایت کی ہے اور جو کچھ میں تمہارے لئے بیان کرتا ہوں ان سب کا سلسلہ سند یہی ہوتا ہے.

اہل بیتؑ پیغمبرؐ سے تمسک کے اہم اور ضروری ہونے کے دلائل

شیعہ اور سنی دونوں فرقوں کے محدثین اس بات کا عقیدہ رکھتے ہیں کہ رسول خداؐ

)۱ (گذشتہ حوالہ ص۱۲۸

نے بھی میراث کے طور پر اپنی امت کے لئے دو قیمتی چیزیں چھوڑی ہیں اور تمام مسلمانوں کو ان کی پیروی کا حکم دیا ہے ان میں سے ایک کتاب خدا ہے اور دوسرے آنحضرتؐ کے اہل بیت ہیں یہاں ہم نمونے کے طور پر ان روایات میں سے بعض کا ذکر کرتے ہیں:

۱۔ ترمذی نے اپنی کتاب صحیح میں جابر بن عبداللہ انصاری سے اور انہوں نے نبی اکرمؐ سے روایت کی ہے:

یا أیّھا النّاس إنّي قد ترکت فیکم ما إن أخذتم بہ لن تضلّوا: کتاب اللہ وعترتي أہل بیتي. (۱(

اے لوگو! میں تمہارے درمیان دو چیزیں چھوڑے جارہا ہوں اگر تم ان سے متمسک رہے تو ہر گز گمراہ نہ ہوگے اور وہ کتاب خدا اور میری عترتؑ ہیں.

۲۔ اسی طرح ترمذی نے اپنی کتاب صحیح میں یہ حدیث نقل کی ہے:

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم إنّي تارک فیکم ما إن تمسکتم بہ لن تضلّوا بعدي أحدھما أعظم من الآخر: کتاب اللہ حبل ممدود من السماء إلی الأرض وعترتي أھل بیتي. ولن یفترقا حتّی یردا

)۱ (صحیح ترمذی، کتاب المناقب، باب مناقب اہل بیت النبی جلد ۵ ص ۶۶۲ حدیث ۳۷۸۶ طبع بیروت.

علیّ الحوض فانظروا کیف تخلفوني فیھما. (۱(

میں تمہارے درمیان دو گرانقدر چیزیں چھوڑے جارہا ہوں جب تک تم ان سے متمسک رہو گے ہر گز گمراہ نہ ہوگے. ان دو چیزوں میں سے ایک دوسری سے بڑی ہے، کتاب خدا ایک ایسی رسی ہے جو آسمان سے زمین تک آویزاں ہے اور دوسرے میرے اہل بیت ہیں اور یہ دونوں ہر گز ایک دوسرے سے جدا نہ ہوں گے یہاں تک کہ حوض کوثر پر مجھ سے آملیں لہذا یہ دیکھنا کہ تم میرے بعد ان کے ساتھ کس طرح کا برتاؤ کرتے ہو.

۳۔ مسلم بن حجاج نے اپنی کتاب صحیح میں پیغمبر اکرمؐ سے یہ روایت نقل کی ہے:

ألا أیّھا النّاس فإنّما أنا بشر یوشک أن یأتي رسول ربّي فأجیب وأنا تارک فیکم ثقلین أولھما کتاب اللہ فیہ الھدیٰ والنور فخذوا بکتاب اللہ واستمسکوا بہ فحثّ علیٰ کتاب اللہ ورغّب فیہ ثم قال: أہل بیتي أذکرکم اللہ في أہل بیتي أذکرکم اللہ في أہل بیتي أذکرکم اللہ في أہل بیتي. (۲(

)۱ (گذشتہ حوالہ ص ۶۶۳ حدیث ۳۷۸۸.

)۲ (صحیح مسلم جزء ۷ فضائل علی ابن ابی طالب ص ۱۲۲ اور ۱۲۳.

اے لوگو! بے شک میں ایک بشر ہوں اور قریب ہے کہ میرے پروردگار کا بھیجا ہوا نمائندہ آئے اور میں اسکی دعوت قبول کروں اور میں تمہارے درمیان دو وزنی چیزیں چھوڑے جارہا ہوں ایک کتاب خدا ہے جس میں ہدایت اور نور ہے کتاب خدا کو لے لو اور اسے تھامے رکھو اور پھر پیغمبر اسلامؐ نے کتاب خدا پر عمل کرنے کی تاکید فرمائی اور اس کی جانب رغبت دلائی اور اس کے بعد یوں فرمایا اور دوسرے میرے اہل بیت ہیں اور میں تمہیں اپنے اہل

بیت کے سلسلے میں وصیت وتاکید کرتاہوں اوراس جملے کو تین مرتبہ دہرایا.

۴۔ بعض محدثین نے پیغمبر اسلامؐ سے یہ روایت نقل کی ہے:

اِنّي تارک فیکم الثقلین کتاب اللہ و اَہل بیتیواِنّھمالن یفترقا حتّی یرداعليّ الحوض(۱ (

بے شک! میں تمہارے درمیان دو وزنی چیزیں چھوڑے جارہاہوں ایک کتاب خدااور دوسرے میرے اہل بیت ہیں اور یہ دونوں ہر گز جدانہ ہوں گے یہاں تک کہ حوض کوثر پر مجھ سے آملیں.

)۱(مستدرک حاکم جز۳ص۱۴۸،الصواعق المحرقہ باب۱۱فصل اول ص۱۴۹اس مضمون کے قریب بعض

درج ذیل کتابوں میں بھی روایات موجود ہیں. مسند احمد جز۵ص ۱۸۲اور ۱۸۳۔ کنزالعمال، جزاول باب الاعتصام بالکتاب والسنۃ ص ۴۴.

یہاں پر اس بات کا ذکر ضروری ہے کہ اس سلسلے میں اتنی زیادہ حدیثیں موجود ہیں کہ ان سب کا اس مختصر کتاب میں ذکر کرنا ممکن نہیں ہے. علامہ میر حامد حسینؒ نے اس روایت کے سلسلۂ سند کو اپنی چھ جلدوں والی کتاب (عبقات الانوار) میں جمع کر کے پیش کیا ہے.

گذشتہ احادیث کی روشنی میں یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ کتاب خدااور سنت نبویؐ کے ساتھ ساتھ آنحضرتؐ کے اہل بیتؑ سے تمسک اوران کی پیروی بھی اسلام کے ضروریات میں سے ہے.

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ عترت پیغمبر ﷺ سے مراد کون افراد ہیں کہ جن کی پیروی کو نبی اکرمؐ نے سب مسلمانوں پر واجب قرار دیا ہے؟

اس مسئلے کی وضاحت کے لئے ہم احادیث کی روشنی میں عترت نبیؐ کے سلسلے میں تحقیق پیش کرناچاہیں گے:

اہل بیتؑ پیغمبر ﷺ کون ہیں؟

گذشتہ روایات سے واضح ہو جاتا ہے کہ پیغمبر اسلامؐ نے سب مسلمانوں کو اپنی عترت کی اطاعت کا حکم دیا ہے اور کتاب خدا کی طرح انہیں بھی لوگوں کا مرجع قرار دیا ہے اور صاف لفظوں میں فرمایا ہے کہ ''قرآن اور عترت ہر گز ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوں گے'' اس بنیاد پر اہل بیت پیغمبرؐ وہ ہیں کہ جنہیں آپؐ نے قرآن مجید کا ہم پلہ قرار دیا ہے اور جو معصوم ہونے کے ساتھ ساتھ معارف اسلامی سے مکمل طور پر آگاہی رکھتے ہیں. کیونکہ اگر وہ ان صفات کے مالک نہ ہوں تو قرآن مجید سے جدا ہو جائیں گے جبکہ پیغمبر اسلامؐ نے فرمایا ہے کہ: قرآن اور عترت ہر گز ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوں گے یہاں تک کہ حوض کوثر پر مجھ سے ملاقات کریں. اس طرح یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ اہل بیت ۲۲۲اور ان کی اعلی صفات کی صحیح طور پر شناخت ایک ضروری امر ہے اب ہم اس سلسلے میں مسلمانوں کے درمیان بزرگ سمجھنے جانے والے محدثین سے منقول روایات کی روشنی میں چند واضح دلیلیں پیش کریں گے :

۱۔ مسلم بن حجاج نے حدیث ثقلین کا ذکر کرنے کے بعد یوں کہا ہے کہ :

''یزید بن حیان نے زید بن ارقم سے پوچھا اہل بیت پیغمبرؐ کون ہیں؟ کیا وہ پیغمبر اکرمؐ کی بیویاں ہیں؟'' زید بن ارقم نے جواب دیا:

لا وأیم اللہ اِنّ المرأۃ تکون مع الرجل العصر من الدھر ثم یطلّقھا فترجع اِلی أبیھا و قومھا أھل بیتہ أصلہ وعصبتہ الذین حرموا الصدقۃ بعدہ.(۱(

نہیں خدا کی قسم عورت جب ایک مدت تک کسی مرد کے ساتھ رہتی ہے اور پھر وہ مرد اسے طلاق دے دیتا ہے تو وہ عورت اپنے باپ اور رشتے داروں کے پاس واپس چلی جاتی ہے اہل بیت

)۱(صحیح مسلم جز ۷ باب فضائل علی بن ابی طالب۔، ص ۱۳۲ طبع مصر.

پیغمبرؐ سے مراد وہ افراد ہیں جو پیغمبر اکرمؐ کے اصلی اور قریبی رشتہ دار ہیں کہ جن پر آنحضرتؐ کے بعد صدقہ حرام ہے.

یہ قول بخوبی اس بات کی گواہی دے رہا ہے کہ وہ عترت پیغمبرؐ جن سے تمسک قرآن کی پیروی کی طرح واجب ہے ان سے ہر گز آنحضرتؐ کی بیویاں مراد نہیں ہیں بلکہ اہل بیت پیغمبرؐ سے وہ افراد مراد ہیں جو آنحضرتؐ سے جسمانی اور معنوی رشتہ رکھنے کے ساتھ ساتھ ان کے اندر چند خاص صلاحتیں بھی پائی جاتی ہوں. تبھی تو وہ قرآن مجید کی طرح مسلمانوں کا مرجع قرار پا سکتے ہیں.

۲۔ پیغمبر اکرمؐ نے صرف اہل بیت ۲۲۲ کے اوصاف بیان کرنے پر ہی اکتفاء نہیں کی تھی بلکہ حضور اکرمؐ نے ان کی تعداد (جو کہ بارہ ہے) کو بھی صاف لفظوں میں بیان کر دیا تھا:

مسلم نے جابر بن سمرہ سے نقل کیا ہے:

سمعت رسول اللہ ﷺ یقول: لا یزال الاِسلام عزیزًا الی اثنی عشر خلیفۃ ثم قال کلمۃ لم اُفھمھا فقلت لأبي ما قال؟ فقال: کلھم من قریش.(۱(

میں نے پیغمبر خدا ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ اسلام کو بارہ خلفاء کے ذریعہ عزت حاصل ہو گی اور پھر پیغمبر اکرمؐ نے کوئی لفظ

)۱(صحیح مسلم جلد ۶ ص ۳ طبع مصر.

کہا جسے میں نہیں سمجھ سکا لہذا میں نے اپنے والد سے پوچھا کہ پیغمبر اکرمؐ نے کیا فرمایا ہے تو انہوں نے جواب دیا کہ پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا ہے کہ وہ سب خلفاء قریش میں سے ہوں گے.

مسلم بن حجاج نے اسی طرح رسول خداؐ سے یہ روایت بھی نقل کی ہے:

لا یزال اُمر الناس ماضیًا ما ولیھم اثنا عشر رجلاً.(۱(

لوگوں کے امور اس وقت تک بہترین انداز میں گزریں گے جب تک ان کے بارہ والی رہیں گے.

یہ دو روایتیں شیعوں کے اس عقیدے کی واضح گواہ ہیں " کہ پیغمبر اسلامؐ کے بعد عالم اسلام کے بارہ امام ہی لوگوں کے حقیقی پیشوا ہیں" کیونکہ اسلام میں ایسے بارہ خلفاء جو پیغمبر اسلامؐ کے بعد بلا فاصلہ مسلمانوں کے مرجع اور عزت اسلام کا سبب بنے ہوں، اہل بیتؑ کے بارہ اماموں کے علاوہ نہیں ملتے کیونکہ اگر اہل سنت کے درمیان خلفاء راشدین کہے جانے والے چار خلفاء سے صرف نظر کر لیا جائے پھر بھی بنی امیہ اور بنی عباس کے حکمرانوں کی تاریخ اس بات کی بخوبی گواہی دیتی ہے کہ وہ ہمیشہ اپنے برے کردار کی وجہ سے اسلام اور مسلمین کی رسوائی کا سبب بنتے رہے ہیں اس اعتبار سے وہ (اہل بیتؑ) کہ جنہیں پیغمبر اسلامؐ نے قرآن مجید کا ہم پلہ اور مسلمانوں کا مرجع

)۱ (گذشتہ حوالہ.

قرار دیا ہے وہ عترت نبیؐ کے وہی بارہ امام ہیں جو سنت نبیؐ کے محافظ اور آنحضرتؐ کے علوم کے خزینہ دار رہے ہیں.

۳۔ حضرت امیر المومنین علی بن ابی طالب۔ کی نگاہ میں بھی مسلمانوں کے ائمہ کو بنی ہاشم سے ہونا چاہیے یہ بات شیعوں کے اس نظریئے (کہ اہل بیتؑ کی شناخت حاصل کرنا ضروری ہے) پر ایک اور واضح دلیل ہے. حضرت امام علی۔ فرماتے ہیں:

اِنّ الأئمۃ من قریش غرسوا في ھذا البطن من بنی ہاشم لا تصلح علی مَن سواھم ولا تصلح الولاۃ من غیر ھم۔(۱(

یاد رکھو قریش کے سارے امام جناب ہاشم کی اسی کشت زار میں قرار دیئے گئے ہیں اور یہ امامت نہ ان کے علاوہ کسی کو زیب دیتی ہے اور نہ ان سے باہر کوئی اس کا اہل ہو سکتا ہے.

نتیجہ: گزشتہ روایات کی روشنی میں دو حقیقتیں آشکار ہو جاتی ہیں:

۱۔ قرآن مجید کی اطاعت کے ساتھ ساتھ اہل بیت ۲۲۲ سے تمسک اور ان کی پیروی بھی واجب ہے.

۲۔ پیغمبر اسلامؐ کے اہل بیت جو قرآن مجید کے ہم پلہ اور مسلمانوں کے مرجع ہیں مندرجہ ذیل خصوصیات کے مالک ہیں:

)۱(نہج البلاغہ (صبحی صالح) خطبہ ۱۴۴.

الف: وہ سب قبیلۂ قریش اور بنی ہاشم کے خاندان میں سے ہیں.

ب: وہ سب پیغمبر اکرمؐ کے ایسے رشتہ دار ہیں جن پر صدقہ حرام ہے.

ج: وہ سب عصمت کے درجے پر فائز ہیں ورنہ وہ عملی طور پر کتاب خدا سے جدا ہو جائیں گے جبکہ پیغمبر اکرمؐ کا ارشاد ہے کہ یہ دونوں (قرآن و عترتؑ) ہر گز ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوں گے یہاں تک کہ حوض کوثر پر مجھ سے آملیں گے.

د: ان کی تعداد بارہ ہے جو یکے بعد دیگرے مسلمانوں کے امام ہوں گے.

ھ: پیغمبر اکرمؐ کے یہ بارہ خلفاء اسلام کی عزت و شوکت کا سبب بنیں گے.

گذشتہ روایات میں موجود اوصاف کو مد نظر رکھنے سے یہ بات آفتاب کی مانند روشن ہو جاتی ہے کہ وہ اہل بیتؑ جن کی پیروی کا پیغمبر اکرمؐ نے حکم فرمایا ہے ان سے آنحضرتؐ کی مراد وہی بارہ ائمہ ۲۲۲ ہیں جن کی پیروی کرنے اور احکام فقہ میں ان سے تمسک اختیار کرنے کو شیعہ اپنے لئے باعث افتخار سمجھتے ہیں۔

انتیسواں سوال

کیاابو طالبؑ ایمان کے ساتھ اس دنیا سے گئے ہیں کہ آپ ان کی زیارت کے لئے جاتے ہیں؟

جواب: حضرت علی۔ کے والد ماجد، رسولؐ کے چچاجناب ابو طالب بن عبد المطلب شیعوں کے عقیدے کے مطابق نبی اکرمؐ کی رسالت پر مکمل ایمان رکھتے تھے اور وہ صدر اسلام کی تمام سختیوں اور مشکلات میں آنحضرتؐ کے سب سے بڑے حامی و ناصر تھے.

خاندان جناب ابو طالبؑ

جناب ابو طالبؑ نے ایسے گھر میں آنکھ کھولی جس کی سرپرستی پیغمبر اکرمؐ کے جد امجد دین ابراہیمی کے پیرو جناب عبد المطلب کے ہاتھوں میں تھی جزیرۂ عرب کی تاریخ میں معمولی غور و فکر سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ جناب عبد المطلب اپنی زندگی کے سخت ترین حالات اور پر خطر مراحل کے دوران بھی خدا پرستی اور آئین توحید کی حمایت سے دستبردار نہیں ہوئے تھے.

جس وقت ابرہہ کا لشکر ہاتھیوں پر بیٹھ کر خانہ کعبہ کو ویران کرنے کے قصد سے مکہ کی طرف آرہا تھا تو اس نے راستے میں جناب عبد المطلب کے اونٹوں کو پکڑ لیا

تھا اور جس وقت جناب عبد المطلب اپنے اونٹوں کے مطالبے کے لئے ابرھہ کے پاس پہنچے تو اس نے بڑے ہی تعجب کے ساتھ ان سے پوچھا کہ آپ نے مجھ سے اپنے اونٹوں کا مطالبہ تو کیا لیکن مجھ سے یہاں سے واپس جانے اور خانہ کعبہ کو ویران نہ کرنے کا مطالبہ نہیں کیا؟ اس وقت جناب عبد المطلب نے اپنے ایمان و اعتقاد پر بھروسہ کرتے ہوئے اسے یہ جواب دیا تھا:

أنا ربّ الإبل وللبیت ربّ یمنعہ (یحمیہ). (۱(

میں اونٹوں کا مالک ہوں اور اس گھر (خانہ کعبہ) کا بھی مالک موجود ہے جو خود اس کی حفاظت و حمایت کرے گا.

اس کے بعد جناب عبد المطلب مکہ کی طرف روانہ ہو گئے. پھر مکہ میں خانہ کعبہ کے دروازے کی کنڈی پکڑ کر یوں کہا:

یا ربّ لا أرجو لھم سواکا یا ربّ فامنع منھم حماکا

إن عدو البیت مَن عاداکا امنعھم أن یخرّبوا فناکا (۲(

)۱(کامل ابن اثیر جلد ا ص ۲۶۱ طبع مصر، ۱۳۴۸ ھ۔

)۲ (گذشتہ حوالہ.

اے پروردگار میں تیرے سوا کسی سے امید نہیں رکھتا. پروردگارا! تو خود ان دشمنوں کے مقابلے میں اپنے حرم کی حفاظت فرما.
اس گھر کے دشمن تجھ سے جنگ کرنا چاہتے ہیں انہیں روک دے تاکہ تیرے گھر کو ویران نہ کر سکیں .

اس قسم کے بلند پایہ اشعار جناب عبدالمطلب کے مومن اور خداپرست ہونے کے واضح گواہ ہیں اسی وجہ سے یعقوبی نے اپنی تاریخ کی کتاب میں جناب عبدالمطلب کے متعلق یوں تحریر کیا ہے:

رفض عبادۃ الأصنام ووحّد اللہ عزّ وجلّ.)۱(

عبدالمطلب نے بتوں کی پوجا سے انکار کیا تھا اور آپ خدا کے موحد بندے تھے.

آیئے اب یہ دیکھا جائے کہ اس مومن اور خداپرست شخصیت کی نگاہ میں ان کے بیٹے ابو طالب کی کیا منزلت تھی؟

عبدالمطلبؑ کی نگاہ میں ابو طالبؑ

تاریخ شاہد ہے کہ بعض روشن ضمیر نجومیوں نے جناب عبدالمطلب کو پیغمبر اکرمؐ کے روشن مستقبل اور ان کی نبوت سے باخبر کر دیا تھا جس وقت ''سیف بن ذی یزان ''

)۱(تاریخ یعقوبی جلد ۲ ص ۷ طبع مصر.

نے حکومت حبشہ کی باگ ڈور سنبھالی تو جناب عبدالمطلب ایک وفد کے ہمراہ حبشہ تشریف لے گئے اس وقت ''سیف بن ذی یزان'' نے ایک اہم خطاب کے بعد جناب عبدالمطلب کو یہ خوشخبری دی ''آپ کے خاندان میں ایک عظیم القدر نبیؐ تشریف لا چکے ہیں'' اس کے بعد اس نے پیغمبر اکرمؐ کے خصوصیات یوں بیان کئے:

اسمہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یموت أبوہ و أمہ ویکفلہ جدّہ وعمّہ.)۱(

انکا نام محمدؐ ہے انکے ماں باپ کا (جلد ہی) انتقال ہو جائے گا اور ان کی سرپرستی ان کے دادا اور چچا کریں گے.

اس وقت اس نے پیغمبر اکرمؐ کے صفات بیان کرتے ہوئے یہ جملے بھی کہے تھے:

یعبد الرّحمٰن ویدحض الشیطان ویخمد النیران ویکسّر الأوثان قولہ فصل وحکمہ عدل ویأمر بالمعروف ویفعلہ وینھیٰ عن المنکر ویبطلہ.)۲(

وہ خدائے رحمن کی عبادت کریں گے، شیطان کے دام میں نہیں آئیں گے، جہنم کی آگ کو بجھائیں گے اور بتوں کو توڑیں

)۱(سیرہ حلبی جلد ا طبع مصر ص ۱۳۶، ۱۳۷، اور طبع بیروت ص ۱۱۴۔۱۱۵.

)۲ (گذشتہ حوالہ.

گے .ان کا قول حق و باطل میں جدائی کا میزان ہو گا وہ دوسروں کو نیکی کا حکم دیں گے اور خود بھی اس پر عمل پیرا ہوں گے وہ دوسروں کو برائی سے روکیں گے اور اسے باطل قرار دیں گے .

اور پھر اس نے جناب عبد المطلب سے کہا:

اِنک لجدہ یا عبد المطلب غیر کذب (۱(

اے عبد المطلب اس میں کوئی جھوٹ نہیں کہ آپ ان کے دادا ہیں .

جناب عبد المطلب نے جب یہ خوشخبری سنی تو سجدہ شکر بجالائے اور پھر اس بابرکت مولود کے احوال کو یوں بیان کیا:

اِنّہ کان لي ابن و کنت بہ معجبًا وعلیہ رقیقاً وَاِنِّي زوجتہ کریمۃ من کرائم قومي آمنۃ بنت وھب بن عبد مناف ابن زھرہ فجاءت بغلام فسمّیتہ محمدًا مات أبوہ و أمہ و کفلتہ أنا وعمّہ (یعنی أباطالب) .(۲(

میرا ایک بیٹا تھا جس سے مجھے بہت زیادہ محبت تھی میں نے اس کی شادی اپنے شرافتمند رشتہ داروں میں سے ایک نیک سیرت خاتون ''آمنہ'' بنت وہب بن عبد مناف سے کی تھی اس

)۱(گذشتہ حوالہ .

)۲(سیرہ حلبی جلد ا ص ۱۳۷ طبع مصر .

خاتون کے ہاں ایک بیٹا پیدا ہوا ہے میں نے اس کا نام محمد رکھا ہے اس کے ماں اور باپ دونوں کا انتقال ہو چکا ہے اس کی سرپرستی میں نے اور اس کے چچا ابو طالب نے اپنی ذمہ لی ہے .

جناب عبد المطلب کے اس کلام سے یہ سمجھ میں آتا ہے کہ وہ اس یتیم بچے

کے روشن مستقبل سے اچھی طرح باخبر تھے اس لئے انہوں نے اس بچے کو اپنے سب سے عزیز بیٹے جناب ابو طالب کی سرپرستی میں دیا تھا اور اس عظیم سعادت کو کسی اور کے نصیب میں نہیں آنے دیا تھا اس سے یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ جناب ابو طالب اپنے مومن اور موحد والد کی نگاہ میں ایمان کے اس درجہ پر فائز تھے کہ صرف وہی پیغمبر اکرمؐ کی سرپرستی کی لیاقت رکھتے تھے .(۱(

اب ہم مزید وضاحت کے لئے جناب ابو طالب کے ایمان پر چند واضح دلیلیں پیش کرتے ہیں:

)۱(زیادہ وضاحت کے لئے ان کتابوں ''سیرہ حلبی'' جلد ا ص ۱۳۴ طبع مصر اور ''سیرہ ابن ہشام'' جلد ا ص ۱۸۹، طبع بیروت اور ''ابو طالب مومن

قریش'' ص۱۰۹ طبع بیروت اور '' طبقات کبریٰ'' جلد ا ص ۱۷ ا طبع بیروت کا مطالعہ مفید ہو گا.

جناب ابو طالب کے مومن ہونے کی دلیلیں

ا۔ جناب ابو طالب کے علمی اور ادبی آثار

مسلمان مورخین اور علماء نے جناب ابو طالب کے بہت سے بلیغ قصیدے اور متعدد قسم کے علمی و ادبی آثار نقل کئے ہیں جو ان کے محکم ایمان کی دلیل ہیں یہاں ہم ان کثیر آثار میں سے بعض کا تذکرہ کرتے ہیں:

لیعلم خیار الناس أن محمداً

نبی کموسیٰ والمسیح ابن مریم

اتانا بھدیٍ مثل ما أتیا بہ

فکل بأمر اللہ یھدي ویعصم (ا(

شریف لوگ یہ جان لیں کہ موسیٰؑ و عیسیٰؑ ابن مریم کی طرح محمد بھی نبی خدا ہیں وہ ہمارے لئے اسی طرح کا پیغام ہدایت لائے ہیں جیسا کہ یہ دو نبی لائے تھے پس سارے نبی، خدا کے حکم سے ہدایت کرتے ہیں اور گناہوں سے روکتے ہیں.

ألم تعلموا أنّا وجدنا محمداً

رسولاً کموسیٰ خط في أول الکتب

وأن علیہ في العباد محبۃ

ولا حیف فیمن خصہ اللہ بالحب (۲(

)ا''(کتاب الحجۃ''، ص ۱۵۷ اور اسی کے مثل مستدرک جلد ۲ ص ۶۲۳ طبع بیروت میں بھی موجود ہے.

)۲(تاریخ ابن کثیر جلد ا ص ۴۲، اور شرح نہج البلاغہ (ابن ابی الحدید) جلد ۱۴ ص ۷۲ (طبع دوم(

کیا تم نہیں جانتے کہ ہم نے موسیٰؑ کی طرح محمد (ص) کو بھی رسول پایا ہے جن کا ذکر پہلی (آسمانی) کتابوں میں بھی آیا ہے؟ لوگ ان سے محبت کرتے ہیں اور جس شخص کے دل کو خداوند عالم نے انکی محبت کیلئے چن لیا ہے اس پر افسوس نہ کیا جائے

لقد أکرم اللہ النبيّ محمّداً

فأکرم خلق اللہ في الناس أحمد

وشقّ لہ من اسمہ لیجلہ

فذو العرش محمود وھذا محمد (ا(

خداوند عالم نے اپنے نبی محمد ﷺ کو مکرم قرار دیا ہے اس اعتبار سے وہ مخلوقات خدا میں سب سے زیادہ مکرم ہیں پروردگار نے ان کے نام کو اپنے نام سے مشتق کیا ہے پس صاحب عرش محمود ہے اور یہ محمدؐ ہیں.

واللہ لن یصلوا إلیک بجمعھم

حتی أوسد في التراب دفینا

فاصدع بأمرک ماعلیک غضاضۃ

وابشر بذلک وقر منک عیونا

ودعوتنی وعلمت أنک ناصحي

ولقد دعوت وکنت ثم أمینا

ولقد علمت بأنّ دین محمد

من خیر أدیان البریّۃ دینا(۲(

)۱(شرح نہج البلاغہ ابن ابی الحدید جلد ۱۴ص ۷۸ طبع دوم، تاریخ ابن عساکر جلد ۱ص ۲۷۵، تاریخ ابن کثیر جلد ۱ صفحہ ۲۶۶، تاریخ الخمیس جلد ۱ص ۲۵۴.

)۲(خزانہ الادب بغدادی جلد ۱ص ۱۲۶ اور تاریخ ابن کثیر جلد ۳ص ۴۲، اور شرح نہج البلاغہ (ابن ابی الحدید) جلد ۱۴ص ۵۵ (طبع دوم) اور فتح الباری جلد ۷ص ۱۵۳ .۱۵۵. اور الاصابہ جلد ۴ص ۱۱۶ (طبع مصر) ۱۳۵۸ھ. اور دیوان ابی طالب ص ۱۲.

)اے رسول خداؐ) خدا کی قسم ہر گز آپؐ کے دشمن آپؐ تک نہ پہنچ پائیں گے یہاں تک کہ میں خاک تلے دفن ہو جاؤں پس آپ کو جس چیز کا حکم ملا ہے بے خوف و خطر اس کا اظہار کریں اور بشارت دے کر آنکھوں کو ٹھنڈک عطا فرمائیں آپؐ نے مجھے اپنے دین کی طرف دعوت دی ہے اور میں جانتا ہوں کہ آپؐ میرے خیر خواہ ہیں بے شک آپؐ اپنی دعوت میں امانت دار ہیں میں نے یہ جان لیا ہے کہ محمدؐ کا دین دنیا کے سارے دینوں سے بہتر ہے.

یاشاھد اللہ علیّ فاشھد إنّي علیٰ دین النبيّ أحمد

من ضل في الدین فإنّي مھتدي(۱(

اے خدا کے مجھ پر گواہ آپ گواہی دیجئے کہ میں احمد، رسول خدا کے دین پر ہوں کوئی اپنے دین میں گمراہ ہو تو ہو، میں تو ہدایت یافتہ ہوں.

و: جناب ابو طالب نے اپنی بابرکت زندگی کے آخری ایام میں قریش کے سرداروں کو جمع کر کے ان اشعار کے ذریعہ انہیں پیغمبر اکرمؐ کی مکمل طور پر حمایت کرنے کی دعوت دی تھی:

أوصي بنصر الخیر أربعۃ

ابني علیًا وشیخ القوم عباسا

وحمزۃ الأسد الحامي لحقیقۃ

وجعفر أن تذودوا دونہ الناسا

کونوا فداءً لکم اُمی وماولدت

في نصر أحمد دوني الناس اتراسا

)۱(شرح نہج البلاغہ (ابن ابی الحدید) جلد ۱۴ص ۷۸اور دیوان ابو طالب ص ۷۵.

میں چار لوگوں کو سب سے افضل نبی کی مدد کرنے کی تاکید کرتا ہوں. اپنے بیٹے علیؑ،اپنے قبیلے کے بزرگ عباس، شیر خدااور مدافع پیغمبرؐ حمزہ اور (اپنے بیٹے) جعفر کو نصیحت کرتا ہوں کہ آنحضرتؐ کے ہمیشہ ناصر و مددگار رہیں اور تم لوگ (میری ماں اور ان کی تمام اولادیں تم سب پر قربان ہوں) احمد کی مدد کے لئے لوگوں کے سامنے سپر بن جانا.(۱(

ہر روشن ضمیر اور انصاف پسند شخص ان بلیغ ادبی آثار(جو صراحت کے ساتھ جناب ابو طالب کے خدااور رسول پر ایمان کامل کی گواہی دے رہے ہیں) کو دیکھ کر شیعوں کے جناب ابو طالب کے ایمان کے سلسلے میں نظریئے کو صحیح مان لے گااور چند سیاسی اہداف کی خاطر بعض مصنفین کی طرف سے مومن قریش، عم پیغمبرؐ اور صدر اسلام کے سخت حالات میں شریعت کے محافظ جناب ابو طالب پر لگائی جانے والی تہمتوں پر افسوس کرے گا.

۲۔جناب ابو طالبؑ کا پیغمبر اکرمؐ کے ساتھ نیک سلوک ان کے ایمان کی علامت ہے.

تمام مشہور مسلمان مورخین نے جناب ابو طالب کی پیغمبر اسلامؐ کے سلسلے میں

)۱(تنشابہات القرآن،(ابن شہر آشوب) سورہ حج کی اس آیت (ولینصرن اللہ من ینصرہ) کی تفسیر سے ماخوذ.

فداکاریوں کو نقل کیا ہے اور یہ چیز جناب ابو طالب کے محکم ایمان کی واضح دلیل ہے کہ جناب ابو طالب نے اسلام کی حمایت اور پیغمبرؐ خدا کی حفاظت کے لئے آنحضرتؐ کے ساتھ تین سال تک اپنا گھر چھوڑ کر ''شعب ابی طالب'' میں زندگی گزاری تھی اور انہوں نے اپنی اس زندگی کو قبیلہ قریش کی سرداری پر ترجیح دی تھی اور مسلمانوں کی اقتصادی پابندی کے خاتمے تک انتہائی سخت حالات ہونے کے باوجود آنحضرتؐ کے ہمراہ رہ کر تمام مشکلات کو برداشت کیا تھا.(۱(

اس سے بڑھ کر یہ کہ جناب ابو طالب نے اپنے عزیز ترین فرزند حضرت علی۔ کو بھی حضور اکرمؐ کی نصرت کرنے اور صدر اسلام کی مشکلات میں آنحضرتؐ کا ساتھ نہ چھوڑنے کا حکم دیا تھا.

ابن ابی الحدید معتزلی نے نہج البلاغہ کی شرح میں جناب ابو طالب کے ان جملوں کو نقل کیا ہے جو انہوں نے حضرت علی۔ سے کہے تھے ملاحظہ ہو:

''پیغمبر خداؐ تمہیں صرف نیکی کی طرف دعوت دیتے ہیں لہذا کبھی ان کا ساتھ نہ چھوڑنا''(۲(

)۱(اس سلسلے میں مزید وضاحت کے لئے درج ذیل کتابوں کا مطالعہ فرمائیں: ۱۔سیرہ حلبی جلد ۱ص ۱۳۴ (طبع دوم مصر) ۲۔تاریخ الخمیس جلد ۱ص ۲۵۳اور ۲۵۴ (طبع ۳بیروت) ۳۔سیرہ ابن ہشام جلد ۱ص ۱۸۹ طبع بیروت. ۴۔(شرح نہج البلاغہ ابن ابی الحدید جلد ۱۴ص ۵۲ طبع دوم) ۵۔(تاریخ یعقوبی اول جلد ۲طبع نجف) ۶۔(الاصابہ جلد ۴ص ۱۱۵ طبع مصر) ۷۔طبقات کبریٰ جلد ۱ص ۱۱۹ طبع بیروت ۱۳۸۰ ھ۔

)۲(شرح نہج البلاغہ (ابن ابی الحدید) جلد ۱۴ص ۵۳ طبع دوم.

اس اعتبار سے جناب ابو طالب کی وہ خدمات جو آپ نے پیغمبر خداؐ کے سلسلے میں انجام دی ہیں اور آپ کی اسلام کے دفاع میں بے لوث فداکاریاں آپ کے ایمان کی واضح گواہ ہیں.

اسی بنیاد پر عالم اسلام کے بزرگ دانشور (ابن ابی الحدید) نے پیغمبر خداؐ کی حفاظت اور دین اسلام کی خدمت کے سلسلے میں جناب ابو طالب کے زندہ کردار سے متعلق یہ اشعار کہے ہیں:

ولولا أبو طالب وابنہ

لما مثّل الدین شخصًا فقاما

فذاک بمکۃ آوىٰ وحامی.

وھذا بیثرب جسّ الحماما

وماضرّ مجد أبي طالب

جھول لعني أو بصیر تعامیٰ(۱(

اگر ابو طالب اور ان کے بیٹے(حضرت علیؑ)نہ ہوتے تو ہر گز دین اسلام کو استحکام حاصل نہ ہوتا ابو طالب نے مکہ میں پیغمبر اکرمؐ کو پناہ دی تھی اور ان کی حمایت کی تھی اور ان کے بیٹے نے یثرب میں (پیغمبر اسلامؐ کی نصرت کے لئے)اپنی جان کی بازیاں لگائی تھیں .

۳۔ابو طالب کی وصیت ان کے ایمان کی گواہ ہے

عالم اسلام کے مشہور مورخین جیسے ''حلبی شافعی'' نے اپنی کتاب سیرۂ حلبی میں اور

)۱(شرح نہج البلاغہ (ابن ابی الحدید) جلد ۱۴ص ۸۴ طبع ۳.

''محمد دیار بکری'' نے اپنی کتاب تاریخ الخمیس میں لکھا ہے کہ جناب ابو طالب نے اپنی زندگی کے آخری لمحات میں اپنے قبیلے سے پیغمبر اسلامؐ کی نصرت کے سلسلے میں یہ وصیت کی تھی:

یامعشر قریش کونوالہ ولاۃ، ولحزبہ حماۃ، واللہ

لایسلک أحد منکم سبیلہ الاّ رشد، ولا یأخذ أحد

بھدیہ الاّ سعد، ولو کان لنفسي مدۃ ولأجلي تأخر لکففت

عنہ الھزائز، ولدفعت عنہ الدواھی، ثم ھلک۔(۱(

اے قبیلہ قریش! تم سب مصطفی کے محب اور ان کے ماننے والوں کے حامی وناصر بن جاؤ خدا کی قسم تم میں سے جو شخص بھی ان کے نقش قدم پر چلے گا وہ ضرور ہدایت پائے گا اور جو کوئی ان سے ہدایت حاصل کرے گا وہ کامیاب ہو جائے گا اگر میری زندگی باقی رہتی اور موت نے مجھے مہلت دی ہوتی تو میں

یقیناً فتنوں اور سختیوں سے آنحضرتؐ کی محافظت کرتا اور پھر یہ آخری کلمات کہتے کہتے جناب ابو طالب نے داعی اجل کو لبیک کہا تھا.

۴۔ پیغمبر

خداؐ کی ابو طالب سے محبت ان کے ایمان کی دلیل ہے

پیغمبر خداؐ نے مختلف موقعوں پر اپنے چچا ابو طالب کا احترام و اکرام کیا ہے اور ان

)۱(تاریخ الخمیس جلد ۱ ص ۳۰۰ اور ۳۰۱، طبع بیروت اور سیرہ حلبی جلد ۱ ص ۳۹۱ (طبع مصر)

سے اپنی محبت کا اظہار فرمایا ہے یہاں ہم ان میں سے صرف دو کا تذکرہ کرتے ہیں:

الف: بعض مورخین نے اپنی کتابوں میں پیغمبر اسلامؐ کی درج ذیل روایت نقل کی ہے جس میں آپؐ نے جناب عقیل بن ابی طالب سے مخاطب ہو کر یوں فرمایا ہے:

إني احبک حبّین حبًّا لقرابتک منّي وحبًّا لما کنت أعلم من حبّ عمي إیّاک (۱)

میں تم سے دوہری محبت کرتا ہوں ایک تمہاری مجھ سے قریبی رشتے داری کی وجہ سے ہے اور دوسری محبت اس وجہ سے ہے کہ میں جانتا ہوں ابو طالب تم سے بہت محبت کرتے تھے.

ب: حلبی نے اپنی کتاب سیرت میں پیغمبر خداؐ کی یہ روایت نقل کی ہے جس میں آپؐ نے جناب ابو طالب کی تعریف فرمائی ہے:

مانالت قریش منّي شیئًا أکرہہ (أي أشد الکراہۃ) حتی مات أبو طالب. (۲)

جب تک ابو طالب زندہ رہے مجھے قریش کسی بھی قسم کی تکلیف نہیں پہنچا سکے۔

رسول خداؐ کا ابو طالب سے محبت کرنا اور ان کی خدمات کو سراہنا جناب ابو طالب

)۱(تاریخ الخمیس جلد ۱ ص ۱۶۳ (طبع بیروت) الاستیعاب جلد ۲ ص ۵۰۹

)۲(سیرہ حلبی جلد ۱ ص ۳۹۱ (طبع مصر).

کے محکم ایمان کی واضح دلیل ہے کیونکہ پیغمبر خداؐ صرف مومنین ہی سے محبت رکھتے تھے اور مشرکین و کفار سے سخت گیری کرتے تھے جیسا کہ قرآن مجید فرماتا ہے:

)مُحَمَّدٌ رَسُولُ اللهِ وَالَّذِینَ مَعَہُ أَشِدَّاءُ عَلَی الْکُفَّارِ رُحَمَاءُ بَیْنَہُمْ...)(۱)

محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اللہ کے رسول ہیں اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں وہ کفار کے لئے سخت ہیں اور آپس میں انتہائی مہربان ہیں.

ایک اور جگہ فرماتا ہے:

)لَا تَجِدُ قَوْمًا یُؤْمِنُونَ بِاللهِ وَالْیَوْمِ الْآخِرِ یُوَادُّونَ مَنْ حَادَّ اللهَ وَرَسُولَہُ وَلَوْ کَانُوا آبَاءَہُمْ أَوْ أَبْنَاءَہُمْ أَوْ إِخْوَانَہُمْ أَوْ عَشِیرَتَہُمْ أُولَئِکَ کَتَبَ فِي قُلُوبِہِمُ الْإِیمَانَ...)(۲)

آپ کو کبھی ایسے افراد نہیں ملیں گے جو اللہ اور روز آخرت پر ایمان رکھنے والے (بھی) ہوں لیکن اللہ اور اس کے رسول کے دشمنوں سے محبت رکھتے ہوں چاہے وہ ان کے باپ یا بیٹے یا بھائی یا خاندان والے ہی کیوں نہ ہوں یہ وہ لوگ ہیں جن کے دلوں میں اللہ نے ایمان لکھ دیا ہے.

)۱(سورہ فتح آیت:۲۹.

)۲(سورہ مجادلہ آیت: ۲۲.

ان آیات کا جب پیغمبر اکرمؐ کی ابو طالب سے محبت اور مختلف موقعوں پر ان کی ستائش سے موازنہ کیا جائے تو اس بات میں کسی قسم کا شک وشبہ باقی نہیں رہ جاتا کہ جناب ابو طالب ایمان کے اعلی ترین درجہ پر فائز تھے.

۵۔ حضرت علی۔ اور اصحاب رسولؐ کی گواہی

حضرت امیر المومنین۔ اور اصحاب پیغمبرؐ نے جناب ابو طالب کے محکم ایمان کی گواہی دی ہے ملاحظہ ہو:

الف: جس وقت حضرت امیر المومنین علی۔ کی خدمت میں ایک شخص نے جناب ابو طالب پر ایک ناروا تہمت لگائی تو حضرت علی۔ کے چہرے پر غصے کے آثار نمایاں ہو گئے اور آپ نے فرمایا:

مہ، فضّ اللہ فاک والذي بعث محمّدًا بالحقّ نبيًّا لو شفع أبي في كل مذنب على وجه الأرض لشفعه الله.(۱(

چپ رہ! اللہ تیرے منہ کو توڑ دے مجھے قسم ہے اس خدا کی جس نے محمدؐ کو برحق نبی قرار دیا ہے اگر میرے والد (ابو طالب) روئے زمین کے سارے گناہ گاروں کی شفاعت کرنا چاہیں تو بھی پروردگار ان کی شفاعت کو قبول کرے گا.

)۱(الحجۃ ص ۲۴.

ایک اور جگہ فرماتے ہیں:

كان والله ابو طالب عبد مناف بن عبد المطلب مؤمنًا مسلمًا يكتم إيمانه مخافة على بني هاشم أن تنابذها قريش.(۱(

خدا کی قسم ابو طالب عبد مناف بن عبد المطلب مومن اور مسلمان تھے اور اپنے ایمان کو قریش کے کفار سے مخفی رکھتے تھے تاکہ وہ بنی ہاشم کو ستا نہ سکیں.

حضرت علی۔ کے یہ ارشادات نہ صرف جناب ابو طالب کے ایمان کی تائید کرتے ہیں بلکہ ان کو ایسے اولیائے خدا کی صف میں کھڑا کر دیتے ہیں جو پروردگار عالم کے اذن سے شفاعت کا حق رکھتے ہیں.

ب: جناب ابوذر غفاریؒ نے جناب ابو طالب کے بارے میں کہا ہے:

والله الذي لا إله إلا هو مات ابو طالبٍ حتّى أسلم.(۲(

قسم ہے اس خدا کی جس کے سوا کوئی معبود نہیں ابو طالبؑ اسلام لانے کے بعد اس دنیا سے رخصت ہوئے ہیں.

)۱(الحجۃ ص ۲۴.

)۲(شرح نہج البلاغہ (ابن ابی الحدید) جلد ۱۴ ص ۷۱ (طبع دوم).

ج: عباس بن عبد المطلب اور ابو بکر بن ابی قحافہ سے بھی بہت سی سندوں کے ساتھ یہ روایت نقل ہوئی ہے:

اِنّ أباطالب مامات حتّٰی قال: لاالہ الااللہ محمد رسول اللہ (۱(

بے شک ابو طالب "لاالہ الااللہ محمد رسول اللہ" کہنے کے بعد دنیا سے رخصت ہوئے ہیں.

۶۔ابو طالب اہل بیتؑ کی نگاہ میں

ائمہ معصومین ۲۲۲ نے جناب ابو طالب کے ایمان کو صاف لفظوں میں بیان فرمایا ہے اور مختلف موقعوں پر پیغمبر اسلامؐ کے اس فداکار کا دفاع کیا ہے یہاں پر ہم ان میں سے صرف دو نمونوں کا تذکرہ کرتے ہیں:

الف: امام محمد باقر۔ فرماتے ہیں:

لو وضع اِیمان أبي طالبٍ في کفۃ میزان واِیمان ھذا الخلق في الکفۃ الأخری لرجح اِیمانہ. (۲(

اگر ابو طالب کے ایمان کو ترازو کے ایک پلڑے میں اور تمام مخلوقات کے ایمان کو اس کے دوسرے پلڑے میں رکھ دیا جائے

)۱(الغدیر، جلد ۷ ص ۳۹۸ تفسیر وکیع سے نقل کرتے ہوئے (طبع ۳ بیروت ۱۳۷۸ ھ.(

)۲(شرح نہج البلاغہ ابن ابی الحدید جلد ۱۴ ص ۶۸ (طبع دوم) الحجۃ ص ۱۸.

تو ایمان ابو طالب ان کے ایمان سے بھاری ہو گا.

ب: امام جعفر صادق۔ رسول اکرمؐ سے نقل فرماتے ہیں:

اِنّ أصحاب الکہف أسرّوا الایمان وأظہروا الکفر فآتاھم اللہ أجرھم مرّتین واِنّ أباطالب أسرّ الایمان وأظہر الشرک فآتاہ اللہ أجرہ مرتین. (۱(

اصحاب کہف (چند مصلحتوں کی وجہ سے) اپنے ایمان کو چھپا کر کفر کا اظہار کرتے تھے تو پروردگار عالم نے انہیں دہرا اجر عطا فرمایا تھا. ابو طالب نے بھی اپنے ایمان کو چھپا کر (کسی مصلحت کی وجہ سے) شرک کا اظہار کیا تو انہیں بھی پروردگار عالم نے دوہرا اجر دیا ہے.

گزشتہ دلیلوں کی روشنی میں آفتاب کی طرح واضح وروشن ہو جاتا ہے کہ

جناب ابو طالب درج ذیل بلند مقامات پر فائز تھے:

۱۔خدا اور رسولؐ پر محکم ایمان.

۲۔پیغمبر خداؐ کے بے لوث حامی وناصر اور راہ اسلام کے فداکار.

۳۔پیغمبر اکرمؐ کے بے نظیر محبوب.

۴۔خداوند عالم کے نزدیک عہدۂ شفاعت کے مالک.

)۱(شرح نہج البلاغہ ابن ابی الحدید جلد ۱۴ص ۷۰ (طبع دوم)الحجۃ ص ۱۱۵.

اس اعتبار سے ثابت ہو جاتا ہے کہ جناب ابو طالب پر لگائی گئی نسبتیں باطل اور بے بنیاد ہیں. جو کچھ بیان ہو چکا ہے اس سے دو حقیقتیں آشکار ہو جاتی ہیں:

۱۔ پیغمبر اکرمؐ، جناب امیر المومنینؑ، ائمہ معصومین ۲۲۲ اور اصحاب پیغمبر ﷺ کی نگاہ میں جناب ابو طالب ایک باایمان شخص تھے.

۲۔ جناب ابو طالب پر کفر کا الزام باطل اور بے بنیاد ہے اور ان پر یہ تہمت بنی امیہ اور بنی عباس (جو ہمیشہ سے اہل بیت ۲۲۲ اور جناب ابو طالب کی اولاد سے جنگ کرتے آئے ہیں) کے اشاروں پر بعض سیاسی مفادات کے تحت لگائی گئی تھی.

اب ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ اس حدیث کا جائزہ لیں جو ''حدیث ضحضاح'' کے نام سے مشہور ہے اور جسے بعض لوگوں نے سند قرار دیتے ہوئے جناب ابو طالب کی شخصیت کو داغدار کرنے کی کوشش کی ہے ہم یہاں قرآنی آیات، سنت نبویؐ اور عقل کی روشنی میں اس حدیث کے باطل اور بے بنیاد ہونے کے دلائل پیش کریں گے:

حدیث ضحضاح کا تحقیقی جائزہ

بعض مصنفین جیسے بخاری اور مسلم نے ''سفیان بن سعید ثوری'' ''عبد الملک بن عمیر'' ''عبد اللہ العزیز بن محمد دراوردی'' ''لیث بن سعد'' جیسے راویوں سے نقل کرتے ہوئے ان دو اقوال کو پیغمبر اکرمؐ سے منسوب کیا ہے:

الف: ''وجدتہ في غمراتٍ من النار فأخرجتہ الی ضحضاح.''

میں نے انہیں آگ کے انبار میں پایا تو انہیں ضحضاح(۱) کی طرف منتقل کر دیا۔

ب: ''لعلہ تنفعہ شفاعتي یوم القیامۃ فیجعل في ضحضاح من النار یبلغ کعبیہ یغلي منہ دماغہ''

قیامت کے دن شاید میری شفاعت ابو طالب کے کام آجائے تاکہ انہیں ضحضاح میں ڈال دیا جائے جس کی گہرائی پاؤں کے ٹخنوں تک ہو گی اور جس میں ان کا (معاذ اللہ) دماغ کھولے گا(۲(

اگرچہ جناب ابو طالب کے ایمان سے متعلق گزشتہ روایات اور دلائل کی روشنی میں اس حدیث ضحضاح کا باطل اور بے بنیاد ہونا اچھی طرح ثابت ہو جاتا ہے لیکن پھر بھی اس مسئلے کی وضاحت کیلئے حدیث ضحضاح سے متعلق دو چیزوں کی تحقیق ضروری ہے:

۱۔ اس حدیث کے سلسلہ سند کا باطل ہونا.

۲۔ اس حدیث کے متن کا کتاب خدا اور سنت پیغمبرؐ بر خلاف ہونا.

)۱''(ضحضاح'' ایسے گڑھے کو کہتے ہیں جس کی گہرائی آدمی کے قد سے کچھ کم ہو.

)۲(صحیح بخاری جلد ۱۵ ابواب مناقب باب قصہ ابو طالب ص ۱۵۲ اور جلد ۸ کتاب الادب باب کنیۃ المشرک ص ۴۶ طبع مصر.

حدیث ضحضاح کے سلسلہ سند کا باطل ہونا

ہم نے بیان کیا تھا کہ اس حدیث کے راوی ''سفیان بن سعید ثوری''،''عبدالملک بن عمیر'' ''عبدالعزیز بن محمد دراوردی'' اور ''لیث بن سعد''ہیں اب ہم ان راویوں کے سلسلے میں اہل سنت کے علمائے رجال کے نظریات کی تحقیق کریں گے:

الف: ''سفیان بن سعید ثوری''

ابو عبداللہ بن احمد بن عثمان ذھبی کا شمار اہل سنت کے بزرگ مرتبہ علمائے رجال میں ہوتا ہے انہوں نے سفیان بن سعید ثوری کے بارے میں یوں کہا ہے:

''کان یدلس عن الضعفاء.''(۱(

سفیان بن سعید ثوری ضعیف راویوں کی گھڑی ہوئی حدیثیں نقل کرتا تھا.

ذہبی کا یہ کلام اس بات کی واضح دلیل ہے کہ سفیان ثوری ضعیف اور مجہول الحال قسم کے افراد سے حدیثیں نقل کیا کرتا تھا اس اعتبار سے اس کی نقل کی ہوئی حدیثوں کا کوئی اعتبار نہیں ہے.

ب: عبدالملک بن عمیر

اس کے بارے میں ذہبی نے بھی کہا ہے:

)۱(میزان الاعتدال (ذہبی) جلد ۲ ص ۱۶۹ طبع ابیروت ۱۳۸۲ ھ

طال عمره وساء حفظه، قال أبو حاتم ليس بحافظ تغيّر حفظه و قال أحمد: ضعيف يخلط و قال ابن معين: مخلط و قال ابن خراش كان شعبة لا يرضاه وذكر الكوسج عن أحمد أنه ضعفه جدًا.(۱(

اس کی عمر زیادہ ہوگئی تھی اور اس کا حافظہ کام نہیں کرتا تھا اور اسی طرح ابو حاتم نے اس کے بارے میں کہا ہے کہ: اس کے اندر حدیثیں حفظ کرنے کی قدرت ختم ہوگئی تھی اور اس کی یاداشت جاتی رہی تھی اسی طرح احمد بن حنبل نے اس کے بارے میں کہا ہے کہ وہ ضعیف تھا صحیح حدیث کو جعلی حدیث سے ملا کر بیان کرتا تھا اور ابن معین نے اس کے بارے میں کہا ہے کہ وہ صحیح اور غلط حدیثوں کو آپس میں ملادیا کرتا تھا اور ابن خراش نے بھی اس کے بارے میں کہا ہے کہ شعبہ بھی اس سے راضی نہ تھے اور کوسج نے احمد ابن حنبل سے یوں نقل کیا ہے کہ وہ عبدالملک بن عمیر کو نہایت ہی ضعیف قسم کا شخص شمار کرتے تھے.

گذشتہ اقوال کے مجموعے سے معلوم ہوتا ہے ''عبدالملک بن عمیر'' درج ذیل صفات کا مالک تھا:

)۱(میزان الاعتدال جلد ۲ ص ۶۶۰ (طبع ۱، بیروت(

۱۔اس کا حافظہ ختم ہو گیا تھا اور وہ بھول جاتا تھا.

۲۔علم رجال کی اصطلاح میں وہ ایک ضعیف شخص تھا اور اسکی روایات پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا.

۳۔بہت زیادہ غلطیاں کرنے والا شخص تھا.

۴۔ صحیح اور غلط کو آپس میں ملا کر بیان کرنے والا شخص تھا۔ واضح ہے کہ مذکورہ صفات میں سے صرف ایک صفت بھی عبدالملک بن عمیر کو ضعیف اور ناقابل اعتماد شخص قرار دینے کیلئے کافی تھی جبکہ اسکے اندر تو یہ سارے نقائص جمع تھے.

ج: عبدالعزیز بن محمد دراوردی

اہل سنت کے علمائے رجال نے اسے حافظہ سے بے بہرہ اور بھول جانے والا ایسا شخص قرار دیا ہے کہ جس کی روایات پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا. احمد بن حنبل نے عبدالعزیز بن محمد دراوردی کے بارے میں یہ کہا ہے: اِذا حدّث من حفظہ جاء بمواطیل. (۱(

جب بھی وہ اپنے حافظے سے کوئی روایت نقل کرتا ہے تو وہ باطل اور بے ہودہ اقوال سے پر ہوتی ہے.

اسی طرح ابو حاتم نے اس کے بارے میں یہ کہا ہے: ''لا یحتج بہ''(۲)اس کی

)۱ (گذشتہ حوالہ ص ۶۳۴.

)۲(گذشتہ حوالہ.

حدیث کے ذیعہ استدلال نہیں کیا جاسکتا. اور ابوزارعہ نے اسکے بارے میں ''سیّء الحفظ''یعنی اس کا حافظہ صحیح نہیں تھا جیسے الفاظ استعمال کئے ہیں(۱(

د: لیث بن سعد

اہل سنت کے علمائے رجال کی کتابوں کے مطالعہ سے یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ وہ راوی جن کے نام ''لیث'' ہیں وہ سب ایسے مجہول الحال یا ضعیف افراد ہیں جن کی نقل کی ہوئی احادیث پر عمل اور اعتماد نہیں کیا جاسکتا(۲) لیث بن سعد بھی انہی ضعیف اور لاپرواہ افراد میں سے تھا جو احادیث کے سننے اور ان کے راویوں سے لینے میں انتہائی لاپرواہی سے کام لیتے تھے.

یحیی بن معین نے اسکے بارے میں کہا ہے: اِنّہ کان یتساہل فی الشیوخ والسماع.(۳(

لیث بن سعد، افراد سے حدیث لینے اور سننے میں لاپرواہی کیا کرتا تھا.

''نباتی'' نے بھی اسے ضعیف افراد میں قرار دیا ہے اور اپنی کتاب ''التذلیل علی الکامل'' (جسے انہوں نے ضعیف افراد کی پہچان کے لئے لکھا ہے) میں ''لیث بن سعد ''

)۱(گذشتہ حوالہ ص ۶۳۴.

)۲(میزان الاعتدال جلد۳ص ۴۲۰تا۴۲۳ طبع ا، بیروت.

)۳ (گذشتہ حوالہ ص ۴۲۳.

کے نام کا بھی ذکر کیا ہے.(۱(

اس بیان سے معلوم ہو جاتا ہے کہ حدیث '' ضحضاح'' کے سارے راوی انتہائی ضعیف تھے لہذا ان سے منقول احادیث پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا.

حدیث ضحضاح کا مضمون قرآن وسنت کے خلاف ہے اس حدیث میں پیغمبر اکرمؐ کی طرف نسبت دی گئی ہے کہ آپؐ نے جناب ابو طالب کو (معاذ اللہ) آگ کے شعلوں کے انبار سے نکال کر ضحضاح کی طرف منتقل کر دیا تھا اس اعتبار سے پیغمبر اکرمؐ نے ان کے عذاب میں کمی کرادی تھی یا آنحضرتؐ نے قیامت کے دن ان کے حق میں شفاعت کرنے کی آرزو کی تھی جبکہ قرآن مجید اور سنت نبویؐ کے اعتبار سے آنحضرتؐ کا عذاب میں کمی کرانے یا شفاعت کرنے کا حق صرف مومنوں اور مسلمانوں سے ہی مخصوص ہے لہذا اگر (معاذ اللہ) جناب ابو طالب کافر ہوتے تو ہر گز پیغمبر اکرمؐ ان کے عذاب میں کمی یا ان کی شفاعت کی آرزو نہ کرتے. اس اعتبار سے یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ (حدیث ضحضاح) کا مضمون باطل اور بے بنیاد ہے اب

ہم قرآن وسنت کی روشنی میں اس مسئلے کی چند واضح دلیلیں پیش کرتے ہیں:

الف: قرآن مجید اس سلسلے میں فرماتا ہے:

)وَالَّذِينَ كَفَرُوا لَهُمْ نَارُ جَهَنَّمَ لَا يُقْضَىٰ عَلَيْهِمْ فَيَمُوتُوا وَلَا يُخَفَّفُ عَنْهُم مِّنْ عَذَابِهَا كَذَٰلِكَ

)۱(شیخ الابطح ص ۷۵ اور میزان الاعتدال جلد۳ص ۴۲۳.

نَجْزِي كُلَّ كَفُورٍ)(۱(

اور جنہوں نے کفر اختیار کیا ان کیلئے جہنم کی آگ ہے نہ تو ان کی قضا آئے گی کہ مر جائیں اور نہ ہی انکے عذاب میں کوئی تخفیف کی جائی گی ہم اسی طرح ہر کفر کرنے والے کو سزا دیا کرتے ہیں.

ب: سنت نبیؐ میں بھی کفار کے حق میں شفاعت کی نفی کی گئی ہے: ابوذر غفاریؓ نے پیغمبر اکرمؐ سے یہ روایت نقل کی ہے:

أعطيت الشفاعة وهي نائلة من أُمتي مَن لا يشرك بالله شيئًا.

مجھے شفاعت کرنے کا حق دیا گیا ہے اور وہ میری امت کے ایسے افراد کے لئے ہو گی جنہوں نے خداوند عالم کے سلسلے میں شرک نہ کیا ہو.

لہذا حدیث ضحضاح کا مضمون باطل، بے بنیاد اور قرآن وسنت کے اصولوں کے خلاف ہے.

نتیجہ

اس بیان کی روشنی میں یہ واضح ہو جاتا ہے کہ حدیث ضحضاح سند و متن کے اعتبار

)۱(سورہ فاطر آیت: ۳۶.

سے ناقابل عمل روایت ہے. اس طرح جناب ابو طالب کی باایمان شخصیت کو داغدار کرنے والی مہمل روایت باطل ہو جاتی ہے اور پیغمبر اکرمؐ کے حامی و ناصر جناب ابو طالب کا ایمان محکم طریقہ سے ثابت ہو جاتا ہے۔

تیسواں سوال

کیا شیعوں کی نظر میں جبرئیل۔نے منصب رسالت کے پہنچانے میں خیانت کی ہے اور کیا یہ صحیح ہے کہ انہوں نے حضرت علی۔کے بجائے قرآن مجید کو رسول اکرمؐ پر نازل کیا ہے؟

جواب: بعض جاہل اور خود غرض افراد نے شیعوں پر یہ تہمت لگائی ہے. اس مسئلے کے جواب سے پہلے ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ اس سوال کے پیدا ہونے کا اصلی سبب بیان کر دیں:

اس تہمت کا اصلی سبب

قرآنی آیات اور احادیث نبوی کے مطابق یہودیوں کا یہ عقیدہ تھا کہ حضرت جبرئیل۔نے رسالت کے پہنچانے میں خیانت کی ہے کیونکہ خداوند عالم نے انہیں حکم دیا تھا کہ منصب نبوت کو خاندان اسرائیل میں قرار دیں لیکن انہوں نے پروردگار عالم کے حکم کی خلاف ورزی کرتے ہوئے منصب نبوت کو

اولاد اسماعیل میں قرار دے دیا اسی بنیاد پر یہودی جناب جبرئیل کو اپنا دشمن سمجھتے ہیں (۱(

اور ان کے بارے میں ہمیشہ ''خان الامین'' ''جبرائیل نے خیانت کی'' کا جملہ استعمال کرتے ہیں اسی وجہ سے قرآن مجید نے ان پر اعتراض کیا ہے اور ان کے نظریئے کو باطل قرار دیتے ہوئے مندرجہ ذیل آیت میں جناب جبرئیل کو فرشتہ ''امین'' کے نام سے یاد کیا ہے:

)نَزَلَ بِہِ الرُّوحُ الْأَمِینُ ۃ عَلیٰ قَلْبِکَ لِتَکُونَ مِنَ الْمُنذِرِینَ)(۲(

اس (قرآن مجید) کو روح الامین (جبرائیل) لے کر نازل ہوئے ہیں یہ آپ کے قلب پر نازل ہوا ہے تاکہ آپ لوگوں کو عذاب الٰہی سے ڈرانے والوں میں سے ہو جائیں.

ایک اور آیت میں ارشاد ہوتا ہے:

) قُلْ مَنْ کَانَ عَدُوًّا لِجِبْرِیلَ فَإِنَّہُ نَزَّلَہُ عَلَیٰ قَلْبِکَ بِإِذْنِ اللہِ)(۳(

)۱(تفسیر فخر رازی جلد ۱ ص ۴۳۶ اور ۴۳۷ طبع مصر ۱۳۰۸ ھ

)۲(سورہ شعراء آیت: ۱۹۴.

)۳(سورہ بقرہ آیت: ۹۳۔۱۹۴.

آپ کہہ دیجئے: جو کوئی جبرئیل کا دشمن ہے وہ یہ جان لے کہ اس نے تو اس قرآن کو حکم خدا سے آپ کے قلب پر نازل کیا ہے.

اگر ان آیات کی تفسیر کا مطالعہ کیا جائے تو یہ بات واضح ہو جائے گی کہ قوم یہود چند وجوہات کی بنا پر جناب جبرئیل کو اپنا دشمن شمار کرتے ہوئے انہیں فرشتہ عذاب اور رسالت پہنچانے میں خیانت کرنے والا تصور کرتی تھی لہذا اس کلمے ''خان الامین'' کا سرچشمہ قوم یہود کا عقیدہ ہے اور بعض جاہل مصنفین نے شیعوں سے اپنی پرانی دشمنی کے نتیجے میں بے انصافی سے کام لیتے ہوئے یہودیوں کے اس جملے کو شیعہ قوم سے منسوب کر دیا ہے.

شیعوں کی نگاہ میں منصب نبوت

شیعہ، قرآن و سنت کی پیروی اور ائمہ معصومین ۲۲۲ کی روایات کی روشنی میں نہ صرف یہ کہ حضرت محمد بن عبداللہ ﷺ کو حکم خدا سے ساری دنیا کے لئے نبی برحق سمجھتے ہیں بلکہ وہ آنحضرتؐ کو آخری نبی اور سید المرسلین بھی مانتے ہیں.

شیعوں کے پہلے امام حضرت علی بن ابی طالب۔ اپنے اس گہربار کلام میں اس حقیقت کی یوں گواہی دیتے ہیں:

و أشھد أن لا الہ الا اللہ وحدہ لا شریک و أشھد أن محمدًا عبدہ و رسولہ خاتم النبیّین و حجۃ اللہ علیٰ العالمین. (۱(

میں گواہی دیتا ہوں کہ کوئی معبود نہیں ہے سوائے اس خدائے واحد کے جس کا کوئی شریک نہیں اور گواہی دیتا ہوں کہ حضرت محمد خدا کے بندے اس کے رسول، خاتم الانبیاء اور سب جہانوں پر خدا کی حجت ہیں.

امام جعفر صادق۔ نیز فرماتے ہیں:

''لم یبعث اللہ عزّ و جلّ من العرب إلا خمسۃ أنبیاء ھودًا و صالحًا و اسماعیل و شعیبًا و محمدًا خاتم النبیّین ﷺ'.'(۲(

خداوند عالم نے پانچ انبیاء کو قوم عرب میں سے مبعوث فرمایا ہے: حضرت ہودؑ، حضرت صالحؑ، حضرت اسماعیلؑ، حضرت شعیبؑ اور خاتم النبیین حضرت محمد مصطفی ﷺ.

یہ حدیث بخوبی شیعوں پر لگائی گئی نسبت کو باطل کر دیتی ہے اور حضرت محمد بن عبداللہ کو خدا کے آخری نبی کی حیثیت سے پہچنواتی ہے(۳ (

)۱(نہج السعادۃ جلد ۱ ص ۱۸۸ طبع بیروت اور کافی جلد ۸ صفحہ ۶۷ طبع ۲ تہران.

)۲(بحار الانوار جلد ۱۱ ص ۴۲ طبع ۲ بیروت ۱۴۰۳ ھ

)۳(پیغمبر اسلامؐ کی خاتمیت کے سلسلے میں زیادہ روایات سے آگاہی کے لئے استاد جعفر سبحانی کی کتاب ''مفاہیم القرآن'' کا مطالعہ فرمائیں.

اسی بنیاد پر تمام شیعہ جناب جبرئیلؑ کو رسالت پہنچانے میں امین سمجھتے ہیں اور اسی طرح ان کا عقیدہ ہے کہ حضرت محمد بن عبداللہ ﷺ خدا کے آخری اور برحق نبی تھے اور حضرت علی بن ابی طالب۔ آنحضرتؐ کے حقیقی وصی اور جانشین تھے۔

یہاں پر ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ پیغمبر اکرمؐ کی درج ذیل حدیث پیش کریں جس کے صحیح ہونے پر شیعہ اور سنی دونوں اتفاق نظر رکھتے ہیں اور دونوں ہی فرقوں کے محدثین نے اس حدیث کو اپنی معتبر کتابوں میں نقل کیا ہے یہ حدیث ''حدیث منزلت'' کے نام سے مشہور ہے اس حدیث میں آپ نے اپنی رسالت کی خاتمیت بیان کرنے کے بعد حضرت علی۔ کو اپنا وصی اور جانشین معین فرمایا ہے پیغمبر اکرم ﷺ نے حضرت علیؑ کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا ہے:

أما ترضیٰ أن تکون منّیّ بمنزلۃ ھارون من موسیٰ الاانّہ لا نبیّ بعدي(۱(

)۱(اس حدیث کے بے شمار ماخذ موجود ہیں ان میں سے بعض یہ ہیں:

۱۔ صحیح بخاری جلد ۶ ص ۳ باب غزوہ تبوک (طبع مصر(

۲۔ صحیح مسلم جلد ۷ ص ۱۲۰ باب فضائل علیؑ (طبع مصر(

۳۔ سنن ابن ماجہ جلد ۱ ص ۵۵ باب فضائل اصحاب النبیؐ (طبع اول مصر(

۴۔ مستدرک حاکم جلد ۳ ص ۱۰۹ (طبع بیروت(

۵۔ مسند احمد جلد ۱ ص ۱۷۰، ۱۷۷، ۱۷۹، ۱۸۲، ۱۸۴، ۱۸۵ اور جلد ۳ میں ص ۳۲

۶۔ صحیح ترمذی جلد ۵ ص ۲۱ باب مناقب علی بن ابی طالب (طبع بیروت.... (

)اے علیؑ) کیا تم اس بات سے خوش نہیں ہو کہ تمہاری نسبت مجھ سے ویسی ہی ہے جیسی ہارون کو موسیٰ سے تھی صرف یہ (فرق ہے) کہ میرے بعد کوئی پیغمبر نہیں آئے گا.

یہ حدیث جو کہ سند کے اعتبار سے شیعہ و سنی محدثین کی نظر میں معتبر ہے شیعوں کے درج ذیل دو نظریوں کی واضح دلیل ہے:

۱۔ حضرت محمد بن عبداللہ ﷺ خدا کے آخری نبی ہیں.

۲۔ حضرت علی بن ابی طالب۔ پیغمبر اکرمؐ کے جانشین اور بلا فصل خلیفہ ہیں۔

.....۷۔ مناقب ابن مغازلی ص ۲۷ طبع بیروت ۱۴۰۳ ھ

۸۔ بحار الانوار جلد ۳۷ ص ۲۵۴ طبع ۲ بیروت ۱۴۰۳ ھ

۹۔ معانی الاخبار (شیخ الصدوق) ص ۷۴ طبع بیروت ۱۳۹۹ ھ

۱۰۔ کنز الفوائد جلد ۲ ص ۱۶۸ طبع بیروت ۱۴۰۵ ھ

اکتیسواں سوال

تقیہ کا معیار کیا ہے؟

جواب: دشمنوں کے مقابلے میں دنیاوی اور دینی نقصانات سے محفوظ رہنے کے لئے اپنے باطنی عقیدے اور ایمان کو چھپانے کا نام تقیہ ہے تقیہ ہر مسلمان شخص کا ایک ایسا شرعی فریضہ ہے جس کا سرچشمہ قرآنی آیات ہیں:

قرآن کی نگاہ میں تقیہ

قرآن مجید میں تقیہ سے متعلق بہت سی آیات ہیں ان میں سے یہاں ہم بعض کا ذکر کرتے ہیں:

)لایَتَّخِذِ الْمُؤمِنُونَ الْکافِرِینَ اَوْلِیاءَ مِنْ دُونِ الْمُؤمِنِینَ وَمَنْ یَفْعَلْ ذٰلِکَ فَلَیْسَ مِنَ اللهِ فِی شَیْءٍ اِلاَّ اَنْ تَتَّقُوا مِنْهُمْ تُقاةً)(۱(

)۱(سورہ آل عمران آیت: ۲۸.

مومنوں کو چاہیے کہ وہ اہل ایمان کو چھوڑ کر کفار کو اپنا ولی اور دوست نہ بنائیں اور جو کوئی ایسا کرے گا اس کا خدا سے کوئی تعلق نہ ہو گا مگر یہ کہ تمہیں کفار سے خوف ہو تو کوئی حرج نہیں ہے.

یہ آیت بخوبی اس بات کی گواہی دیتی ہے کہ کفار کے ساتھ دوستی رکھنا جائز نہیں ہے لیکن اگر جان خطرہ میں ہو تو تقیہ کرتے ہوئے ان سے ظاہری طور پر دوستی کا اظہار کیا جاسکتا ہے.

ب:(مَنْ کَفَرَ بِاللهِ مِنْ بَعْدِ اِیمانِهِ اِلاَّ مَنْ اُکْرِهَ وَقَلْبُهُ مُطْمَئِنٌّ بِالْاِیمانِ وَلٰکِنْ مَنْ شَرَحَ بِالْکُفْرِ صَدْرًا فَعَلَیْهِمْ غَضَبٌ مِنَ اللهِ وَلَهُمْ عَذابٌ عَظِیمٌ)(۱(

جو شخص بھی ایمان لانے کے بعد کفر اختیار کرلے سوائے اس کے جسے کفر پر مجبور کر دیا جائے اور اس کا دل ایمان سے مطمئن ہو (تو کوئی حرج نہیں ہے) لیکن وہ شخص جس کے سینہ میں کفر کے لئے کافی جگہ پائی جاتی ہو اس کے اوپر خدا کا غضب ہے اور اس کے لئے بہت بڑا عذاب ہے.

مفسرین نے اس آیت کے شان نزول میں یہ لکھا ہے: ایک دن کفار نے جناب عمار ابن یاسر کو ان کے ماں باپ کے ہمراہ گرفتار کر لیا اور ان سے کہنے لگے کہ اسلام کو

)۱(سورہ نحل آیت: ۱۰۶

چھوڑ کر کفر و شرک اختیار کرلو تو عمار بن یاسر کے ہمراہ افراد نے ان کے جواب میں توحید و رسالت کی گواہیاں دینا شروع کر دیں جس پر کفار نے ان میں سے بعض کو شہید کر ڈالا اور بعض پر طرح طرح کے ظلم و ستم ڈھانے لگے اس وقت جناب عمار نے اپنے باطنی عقیدے کے بر خلاف تقیہ اختیار کر کے ظاہری طور پر کفر کے کلمات کو اپنی زبان پر جاری کیا تو کفار نے انہیں چھوڑ دیا پھر اسکے بعد جناب عمار انتہائی پریشانی کے عالم میں رسول خدا کی خدمت میں پہنچے تو آنحضرت نے انہیں تسلی دی اور پھر اس سلسلے میں یہ آیت نازل ہوئی.(۱ (

اس آیت اور اس کی تفسیر سے بخوبی معلوم ہو جاتا ہے کہ پیغمبر خداؐ کے زمانے میں اصحاب بھی جان و مال کی حفاظت کے لئے اپنے باطنی عقیدے کو چھپا کر تقیہ کرتے تھے.

تقیہ شیعوں کی نگاہ میں

بنی امیہ اور بنی عباس کے ظالم حکمران ہمیشہ شیعوں سے برسرپیکار رہے ہیں اور انہوں نے شیعوں کے قتل عام میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی ہے(۲ (

)۱(اس سلسلے میں جلال الدین سیوطی کی تفسیر درالمنثور جلد ۴ص ۱۳۱ (طبع بیروت) کا مطالعہ کیجئے.

)۲(بنی امیہ اور بنی عباس کے حکام کے حکم پر شیعوں کے بے رحمانہ قتل عام کے سلسلے میں تفصیلی معلومات حاصل کرنے کے لئے ان کتابوں ''مقاتل الطالبین''(مصنفہ ابوالفرج اصفہانی) ''شہداء الفضیلۃ(مصنفہ علامہ امینی)''، ''الشیعہ والحاکمون''(مصنفہ محمد جواد مغنیہ) کا مطالعہ مفید ثابت ہوگا.

اس بناپر اس زمانے میں شیعوں نے قرآن مجید کے حکم کے مطابق انتہائی سخت حالات میں اپنے سچے عقائد چھپا کر اپنی اور دوسرے مسلمان بھائیوں کی جانیں محفوظ کی تھیں واضح ہے کہ اس ظلم وستم کی فضا میں شیعوں کے لئے تقیہ کے علاوہ کوئی ایسا چارۂ کار نہیں تھا جو شیعوں کو نابودی سے بچاتا لہذا اگر وہ ظالم حکام، شیعوں کے دشمن نہ ہوتے اور شیعوں کا بے گناہ قتل عام نہ کرتے تو ہرگز شیعہ تقیہ اختیار نہ کرتے یہاں پر اس نکتے کا ذکر بھی ضروری ہے کہ تقیہ صرف شیعوں سے ہی مخصوص نہیں ہے بلکہ دوسرے مسلمان بھی جب اپنے ایسے دشمنوں کے مقابلے میں قرار پاتے ہیں جو مسلمانوں کے تمام فرقوں کے دشمن ہیں (جیسے کہ خوارج اور وہ ظالم حکومتیں جو ہر حرام کام کو جائز سمجھتی ہیں) اور ان سے مقابلہ کی طاقت بھی نہیں ہوتی تو وہ اپنی جان کی حفاظت کی خاطر تقیہ کا سہارا لیتے ہیں اس بنیاد پر اگر اسلامی معاشرے کے تمام افراد اپنے فقہی مذاہب میں اتفاق رائے رکھتے ہوئے وحدت واخوت کی زندگی گزارنا شروع کردیں تو پھر ہرگز انھیں تقیہ کی ضرورت باقی نہیں رہے گی.

نتیجہ

گزشتہ بحث سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ :

۱۔ تقیہ کی اساس قرآن مجید پر ہے اور صدر اسلام میں پیغمبر اکرمؐ کے اصحاب بھی تقیہ کرتے تھے اور آنحضرتؐ ان کے اس عمل کی تائید فرماتے تھے یہ سب تقیہ کے جائز ہونے کی دلیلیں ہیں.

۲۔ شیعہ اپنے مذہب کو بچانے اور دشمنوں کے سفاکانہ قتل عام سے محفوظ رہنے کے لئے تقیہ کرتے تھے.

۳۔ تقیہ صرف شیعوں سے مخصوص نہیں ہے بلکہ دوسرے مسلمان بھی تقیہ کرتے ہیں.

۴۔ تقیہ کرنا اور اپنے باطنی عقائد چھپانا صرف کفار کے مقابلے میں ہی انجام نہیں پاتا بلکہ تقیہ کا معیار (مسلمانوں کی جان بچانا) عمومیت رکھتا ہے اور ہر ایسے ظالم دشمن کے سامنے کہ جس کے ساتھ مقابلے کی قدرت نہ ہو یا اس سے جہاد کرنے کے شرائط پورے نہ ہو رہے ہوں تقیہ ضروری ہو جاتا ہے.

۵۔ اگر مسلمانوں میں مکمل وحدت اور ہم فکری پیدا ہو جائے تو ہرگز ان کے درمیان تقیہ کی ضرورت باقی نہیں رہے گی.

بتیسواں سوال

ایران کے بنیادی قانون میں کیوں جعفری مذہب)شیعہ اثنا عشری) کو حکومت کا مذہب قرار دیا گیا ہے ؟

جواب: اس میں شک نہیں کہ جمہوری اسلامی ایران کے بنیادی قانون کی نظر میں تمام اسلامی مذاہب محترم و معزز شمار کئے جاتے ہیں لیکن یہ بات بھی طے ہے کہ اسلامی و فقہی مذاہب (: جیسے جعفری، مالکی، شافعی، حنبلی، حنفی و...) کے ماننے والے اپنے فردی اور اجتماعی احکام میں یکساں اور متحد نہیں ہیں اور ان کے درمیان بہت سے اختلافات دکھائی دیتے ہیں دوسری طرف سے ایک معاشرے کے قوانین و حقوق کا آپس میں منظم اور یک رنگ ہونا وقت کی شدید ترین ضرورت ہے اس اعتبار سے واضح ہے کہ ہر سرزمین پر ان مذاہب میں سے صرف ایک مذہب ہی اجتماعی قوانین کو نافذ کر سکتا ہے اس لئے کہ قانون گزاروں کے مختلف ہونے سے کبھی بھی ایک جیسے اور یکساں قوانین نہیں بنائے جا سکتے اس بنیاد پر یہ ضروری ہے کہ ہر معاشرے میں اسلامی اور فقہی مذاہب میں سے صرف ایک مذہب ہی باضابطہ طور پر اجتماعی قوانین کا ماخذ قرار پائے تاکہ اس مملکت کے قوانین و ضوابط میں کسی طرح کی دوروئی اور بد نظمی پیدا نہ ہونے پائے اور فردی و اجتماعی امور میں منظم اور یکساں قوانین و ضوابط بنانے کا زمینہ ہموار ہو سکے.

جعفری مذہب کی تعیین کا معیار

گزشتہ وضاحت کے بعد اب دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آپ نے کس معیار کے تحت تمام مذاہب میں سے صرف جعفری مذہب کو ملک کے قوانین و ضوابط کا ماخذ قرار دیا ہے؟

اس سوال کا جواب بالکل واضح ہے چونکہ ایران میں عوام کی اکثریت ایسے مسلمانوں کی ہے جو جعفری مذہب کو مانتے ہیں لہذا اس ملک کے بنیادی قوانین میں جعفری مذہب کو ملک کا رسمی مذہب قرار دیا گیا جو کہ ایک فطری امر ہے اور تمام منطقی اور حقوقی ضابطوں سے پوری طرح مطابقت رکھتا ہے.

ایران میں دوسرے اسلامی مذاہب کا درجہ

اگرچہ ایران کے بنیادی قوانین میں جعفری مذہب کو ملک کا رسمی مذہب قرار دیا گیا ہے لیکن اس کے باوجود اس اسلامی مملکت میں دوسرے اسلامی مذاہب (جیسے شافعی، حنبلی، حنفی، مالکی، اور زیدی کو) نہ صرف محترم شمار کیا گیا ہے بلکہ ان مذاہب کے ماننے والوں کو درج ذیل امور میں اپنی فقہ پر عمل کرنے میں مکمل اختیار بھی دیا گیا ہے:

۱۔ اپنے مذہبی مراسم کے انجام دینے میں.

۲۔ اپنی دینی تعلیم و تربیت کے سلسلے میں.

۳۔ اپنے ذاتی اور شخصی کاموں کو انجام دینے میں.

۴۔ اپنے مذہب کے خصوصی قوانین وضوابط میں (جیسے نکاح، طلاق، میراث، وصیت وغیرہ.(

اس کے علاوہ اگر کسی علاقے میں مذکورہ مذاہب میں سے کسی مذہب کے ماننے والوں کی تعداد زیادہ ہو گی وہاں کے قونصل خانوں میں ان کے لئے ان کے مذہب کے مطابق قوانین وضوابط وضع کئے جائیں گے اور ساتھ ہی ساتھ دوسرے مذاہب کے لوگوں کے حقوق بھی محفوظ رہیں گے.

یہاں پر اس موضوع کی مزید وضاحت کے لئے ہم ایران کے بنیادی قانون کی بارہویں اصل کو آپ کی خدمت میں پیش کرتے ہیں:

"ایران کا رسمی دین اسلام اور مذہب جعفری اثنا عشری ہے یہ ہمیشہ رہے گا اور ناقابل تبدیل ہو گا اور ساتھ ہی ساتھ دوسرے مذہبوں. جیسے شافعی، حنبلی، حنفی، مالکی، اور زیدی مذاہب کے ماننے والے بھی مکمل طور پر محترم شمار کئے جائیں گے" اور ان مذاہب کے پیرو اپنی فقہ کے مطابق اپنے مذہبی رسومات کے انجام دینے میں آزاد ہوں گے اور اسی طرح وہ اپنی دینی تعلیم و تربیت اور اپنے ذاتی مسائل جیسے نکاح، طلاق، میراث، وصیت، لڑائی جھگڑوں کے مسائل اور عدالتوں میں مقدموں کے سلسلے میں رسمی طور پر اپنے مذہب کی فقہ پر عمل کرنے کا اختیار رکھتے ہیں اور جس جگہ بھی مذکورہ مذاہب میں سے کسی ایک مذہب کے پیرو اکثریت میں ہوں گے اس جگہ کے علاقائی قوانین ان کے مذہب کے مطابق ہوں گے اور ساتھ ہی ساتھ دوسرے مذاہب کے ماننے والوں کے حقوق بھی محفوظ ہوں گے ایران کے قانون اساسی کی اس بارہویں اصل کی روشنی میں تمام اسلامی مذاہب کا احترام روشن ہو جاتا ہے۔

تینتیسواں سوال

کیا شیعہ نماز وتر کو واجب سمجھتے ہیں؟

جواب: نوافل شب میں سے ایک نماز وتر بھی ہے جس کا پڑھنا اسلام کے ماننے والوں اور رسولؐ خدا کی پیروی کرنے والوں کے لئے مستحب ہے لیکن شیعہ فقہاء نے کتاب وسنت کی روشنی میں چند امور کو پیغمبر اسلامؐ کی خصوصیات میں سے قرار دیا ہے ان ہی میں سے ایک حضورؐ پر اس نماز کا واجب ہونا بھی ہے. چنانچہ علامہ حلی نے اپنی کتاب "تذکرۃ الفقہاء" میں تقریباً ستر چیزوں کو پیغمبر اکرمؐ کی خصوصیات میں شمار کیا ہے اور انہوں نے اپنے کلام کے آغاز ہی میں یہ کہا ہے:

"فأمّا الواجبات علیہ دون غیرہ من أمّتہ أمور: الف۔ السواک، ب۔ الوتر، ج۔ الأضحیہ، روي عنہؐ أنہ قال: ثلاث کتب عليّ ولم تکتب علیکم: السواک والوتر والأضحیّۃ... "(۱(

)۱(تذکرۃ الفقہاء جلد ۲ کتاب ا لنکاح مقدمہ چہارم۔

وہ چیزیں جو صرف پیغمبر اسلامؐ پر واجب ہیں اور ان کی امت کے لئے واجب نہیں ہیں وہ یہ ہیں: الف: مسواک کرنا، ب: نماز وتر پڑھنا، ج: قربانی کرنا. رسول خدا سے نقل ہوا ہے کہ آنحضرتؐ نے فرمایا ہے: تین چیزیں میرے اوپر واجب کی گئی ہیں لیکن تم لوگوں پر واجب نہیں ہیں اور وہ ہیں مسواک کرنا، نماز وتر پڑھنا اور قربانی کرنا" اس بنیاد پر نماز وتر شیعوں کی نظر میں صرف رسول خداؐ پر واجب ہے اور دوسروں کے لئے اس کا پڑھنا مستحب ہے.

چونتیسواں سوال

کیااولیائے خدا کی غیبی طاقت پر عقیدہ رکھنا شرک ہے؟

جواب: یہ بات واضح ہے کہ جب کبھی کوئی شخص دوسرے سے کسی کام کی درخواست کرتا ہے تو وہ اس شخص کو اس کام کے انجام دینے میں اپنے سے قوی اور طاقتور سمجھتا ہے اور یہ طاقت دو قسم کی ہوتی ہے:

۱۔ کبھی یہ قدرت مادی اور فطری ہوتی ہے جیسے ہم کسی شخص سے کہیں مجھے ایک گلاس پانی لادو.

۲۔ بعض اوقات یہ طاقت مادی اور فطری نہیں ہوتی بلکہ غیبی صورت میں ہوتی ہے جیسے کسی شخص کا یہ عقیدہ ہو کہ خدا کے کچھ نیک بندے جناب عیسیٰ کی طرح لاعلاج مرض سے شفا عطا کرنے کی طاقت رکھتے ہیں اور مسیحائی کا مظاہرہ کرتے ہوئے شدید قسم کے مریض کو بھی نجات عطا کرتے ہیں یہ بات واضح ہے کہ اس قسم کی غیبی طاقتوں پر انہیں خدا کے ارادے اور قدرت کا محتاج سمجھ کر عقیدہ رکھنا فطری و مادی قدرتوں پر عقیدہ رکھنے کی طرح ہے اور یہ ہر گز شرک قرار نہیں پاسکتا اس لئے کہ خداوند عالم ہی نے یہ مادی اور فطری طاقتیں انسان کو عطا کی ہیں اور اسی نے غیبی طاقتوں کو اپنے نیک بندوں کو عنایت فرمایا ہے.

یہاں پر ہم اس جواب کی مزید وضاحت کرنے کے لئے یہ کہیں گے کہ اولیائے خدا کی غیبی قدرت و طاقت پر دو طرح سے عقیدہ رکھا جاسکتا ہے:

۱۔ کسی شخص کی غیبی قدرت پر اس طرح عقیدہ رکھا جائے کہ اسے اپنی اس طاقت میں مستقل اور اصل سمجھیں اور خدائی امور کو مستقل طور پر اس کی طرف نسبت دینے لگیں اس صورت میں شک نہیں کہ یہ عقیدہ شرک شمار ہوگا کیونکہ اس طرح ہم نے غیر خدا کو طاقت میں مستقل سمجھ کر خدائی امور کو غیر خدا کی طرف منسوب کر دیا ہے جب کہ یہ طے ہے کہ پروردگار عالم کی لامتناہی طاقت و قدرت ہی سے تمام طاقتوں اور قدرتوں کا سرچشمہ بنا ہے.

۲۔ خدا کے نیک اور باایمان بندوں کی غیبی طاقت پر اس طرح اعتقاد رکھیں کہ انہوں نے اپنی یہ قدرت پروردگار عالم کی لامحدود قدرت سے حاصل کی ہے اور در حقیقت ان قدرتوں کو حاصل کرنے کا سبب یہ ہے کہ ان کے ذریعے خدا کی لامحدود قدرت کا اظہار کیا جاسکے اور وہ خود اپنی ذات میں کسی طرح کا استقلال نہیں رکھتے ہیں بلکہ وہ اپنی ہستی اور اپنی غیبی قدرت کے استعمال میں پوری طرح ذات پروردگار پر منحصر ہیں.

واضح ہے کہ اس طرح کا عقیدہ اولیائے الٰہی کو خدا سمجھنے یا ان کی طرف خدائی امور کی نسبت دینے کی طرح نہیں ہے کیونکہ اس صورت میں پروردگار عالم کے نیک بندے اس کی اجازت اور ارادے سے اس کی عطا کردہ غیبی طاقت کا اظہار کرتے ہیں. قرآن مجید اس سلسلے میں فرماتا ہے:

)وَمَا كَانَ لِرَسُولٍ أَنْ يَأْتِيَ بِآيَةٍ إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ)(۱(

اور کسی رسول کو یہ اختیار نہیں ہے کہ وہ اللہ کی اجازت کے بغیر کوئی نشانی لے آئے.

اس بیان کی روشنی میں واضح ہو جاتا ہے کہ ایسا عقیدہ باعث شرک قرار نہیں پائے گا بلکہ توحید و یکتا پرستی سے مکمل طور پر مطابقت رکھنے والا عقیدہ نظر آئے گا.

قرآن مجید کی نظر میں اولیائے الٰہی کی غیبی طاقت

مسلمانوں کی آسمانی کتاب نے وضاحت کے ساتھ پروردگار عالم کے ان نیک بندوں کا تذکرہ کیا ہے جنہوں نے پروردگار عالم کی اجازت سے اپنی حیرت انگیز قدرت کا مظاہرہ کیا تھا اس سلسلے میں قرآن مجید کے بعض جملے ملاحظہ ہوں:

۱۔ حضرت موسیٰ کی غیبی طاقت

خداوند عالم نے حضرت موسیٰؑ کو حکم دیا تھا کہ اپنے عصا کو پتھر پر ماریں تاکہ اس

)۱(سورہ رعد آیت: ۳۸

سے پانی کے چشمے جاری ہو جائیں:

)وَإِذِ اسْتَسْقَىٰ مُوسَىٰ لِقَوْمِهِ فَقُلْنَا اضْرِب بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ فَانفَجَرَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا)(۱(

اور اس وقت کو یاد کرو جب موسیٰ نے اپنی قوم کے لئے پانی طلب کیا تو ہم نے کہا: اپنا عصا پتھر پر مارو جس کے نتیجے میں اس سے بارہ چشمے پھوٹ نکلے.

حضرت عیسیٰؑ کی غیبی طاقت

قرآن مجید میں مختلف اور متعدد مقامات پر حضرت عیسیٰؑ کی غیبی قدرت کا تذکرہ ہوا ہے ہم ان میں سے بعض کو یہاں پیش کرتے ہیں:

)أَنِّي أَخْلُقُ لَكُم مِّنَ الطِّينِ كَهَيْئَةِ الطَّيْرِ فَأَنفُخُ فِيهِ فَيَكُونُ طَيْرًا بِإِذْنِ اللَّهِ وَأُبْرِئُ الْأَكْمَهَ وَالْأَبْرَصَ وَأُحْيِي الْمَوْتَىٰ بِإِذْنِ اللَّهِ)(۲(

)حضرت عیسیٰؑ نے فرمایا) میں تمہارے لئے مٹی سے پرندے کی شکل کا مجسمہ بناؤں گا اور اس میں پھونک ماروں گا تو وہ خدا کے حکم سے پرندہ بن جائے گا اور میں پیدائشی اندھے اور برص

)۱(سورہ بقرہ آیت: ۶۰

)۲(سورہ آل عمران آیت: ۴۹

کے مریض کا علاج کروں گا اور خدا کے حکم سے مردوں کو زندہ کروں گا.

حضرت سلیمانؑ کی غیبی طاقت

حضرت سلیمانؑ کی غیبی طاقتوں کے سلسلے میں قرآن مجید یہ فرماتا ہے:

)وَوَرِثَ سُلَيْمَانُ دَاوُودَ وَقَالَ يَا أَيُّهَا النَّاسُ عُلِّمْنَا مَنْطِقَ الطَّيْرِ وَأُوتِينَا مِنْ كُلِّ شَيْءٍ إِنَّ هَذَا لَهُوَ الْفَضْلُ الْمُبِينُ)(۱(

اور سلیمانؑ، داؤدؑ کے وارث بنے اور انہوں نے کہا اے لوگو! ہمیں پرندوں کی زبان کا علم دیا گیا ہے اور ہمیں ہر طرح کی چیزیں عنایت کی گئی ہیں بے شک یہ تو ایک نمایاں فضل ہے.

اس میں شک نہیں ہے کہ اس قسم کے کام جیسے حضرت موسیٰؑ کا سخت پتھر پر عصا مار کر پانی کے چشمے جاری کر دینا حضرت عیسیٰؑ کا گیلی مٹی سے پرندوں کا خلق کر دینا اور لاعلاج مریضوں کو شفا عطا کرنا اور مردوں کو زندہ کرنا حضرت سلیمانؑ کا پرندوں کی زبان سمجھنا یہ سب نظام فطرت کے خلاف شمار ہوتے ہیں اور در حقیقت انبیائے الٰہی نے اپنے ان کاموں کو اپنی غیبی طاقتوں کا استعمال کرتے ہوئے انجام دیا ہے.

جب قرآن مجید نے اپنی آیات میں بیان کیا ہے کہ خداوند عالم کے نیک بندے

)۱(سورہ نمل آیت:۱۶

غیبی طاقت رکھتے ہیں تو اب کیا ان آیات کے مضامین پر عقیدہ رکھنا شرک یا بدعت شمار کیا جا سکتا ہے؟ ان بیانات کی روشنی میں بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ خدا کے نیک بندوں کی غیبی قدرتوں پر عقیدہ رکھنے کے معنی یہ نہیں ہیں کہ انہیں خدا مانا جائے یا ان کی طرف خدائی امور کی نسبت دی جائے اس لئے کہ ان کے بارے میں اس قسم

کے عقیدہ سے ان کی خدائی لازم آتی ہے اور اگر ایسا ہے تو پھر حضرت موسیٰ حضرت عیسیٰ اور حضرت سلیمان وغیرہ قرآن کی نظر میں خدا شمار ہونگے جب کہ سب مسلمان یہ جانتے ہیں کہ کتاب الٰہی کی نگاہ میں اولیائے الٰہی صرف خدا کے نیک بندوں کی حیثیت رکھتے ہیں یہاں تک کی گفتگو سے معلوم ہو جاتا ہے کہ اولیائے الٰہی کی غیبی طاقت کے سلسلے میں یہ عقیدہ رکھنا کہ انہیں یہ قدرت پروردگار کی لامحدود قدرت ہی سے حاصل ہوئی ہے اور در حقیقت ان کی اس قدرت کے ذریعے پروردگار عالم کی لامحدود قدرت کا اظہار ہوتا ہے تو اس صورت میں ہمارے یہ عقائد باعث شرک قرار نہیں پائیں گے بلکہ عقیدہ توحید کے ساتھ مکمل طور پر ہم آہنگ نظر آئیں گے کیونکہ توحید اور یکتا پرستی کا معیار یہ ہے کہ ہم دنیا کی تمام قدرتوں کو خدا کی طرف پلٹائیں اور اسی کی ذات کو تمام قدرتوں اور جنبشوں کا سرچشمہ قرار دیں۔

پینتیسواں سوال

کیوں منصب امامت منصب رسالت سے افضل ہے؟

جواب: اس سوال کے جواب کے لئے سب سے پہلے ہم قرآن وحدیث کی روشنی میں ان تین لفظوں نبوت، رسالت اور امامت کی وضاحت پیش کریں گے تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ منصب امامت ان دو منصبوں سے افضل ہے.

۱۔ منصب نبوت

لفظ نبی کو ''نبأ'' سے اخذ کیا گیا ہے جس سے مراد ''اہم خبر'' ہے اس اعتبار سے نبی کے لغوی معنی ہیں وہ شخص جس کے پاس کوئی اہم خبر ہو یا وہ اس خبر کو پہنچانے والا ہو. (۱(

قرآن کی اصطلاح میں بھی ''نبی'' ایسے شخص کو کہا جاتا ہے جو خداوند عالم سے مختلف طریقوں سے وحی حاصل کرتا ہو اور کسی بشر کے واسطے کے بغیر خدا کی طرف سے خبر دیتا ہو علماء نے نبی کی یہ تعریف کی ہے:

)۱(اگر نبی صیغۂ لازم ہو گا تو پہلے معنی میں ہو گا اور اگر متعدی ہو گا تو دوسرے معنی میں ہو گا.

اِنّہ مؤدٍ من اللہ بلا واسطۃ من البشر (۱(

نبی ایسا شخص ہے جو کسی بشر کے واسطے کے بغیر خدا کی طرف سے پیغام پہنچاتا ہے

اس بنیاد پر ''نبی'' کا کام صرف یہ ہے کہ پروردگار عالم سے وحی حاصل کرے اور اس پر جو الہام ہوا ہے اسے لوگوں تک پہنچادے اور بس. قرآن مجید اس سلسلے میں یہ فرماتا ہے:

)فبعث اللہ النبیّین مبشرین ومنذرین)(۲(

پھر اللہ نے بشارت دینے والے اور ڈرانے والے انبیاء بھیجے.

۲۔ منصب رسالت

وحی الٰہی کی اصطلاح میں رسول ان پیغمبروں کو کہا جاتا ہے جو خدا سے وحی لینے اور اسے لوگوں تک پہنچانے کے علاوہ خدا کی طرف سے اس کی شریعت کو

بیان کرنے اور اپنی رسالت کے اعلان کرنے کی اجازت بھی رکھتے ہوں قرآن مجید اس سلسلے میں یہ فرماتا ہے:
)فَإِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاعْلَمُوا أَنَّمَا عَلَىٰ رَسُولِنَا الْبَلَاغُ الْمُبِينُ)(۳(

)۱(رسائل العشر (مصنفہ شیخ طوسیؒ) ص ۱۱۱.

)۲(سورہ بقرہ آیت: ۲۱۳.

)۳(سورہ مائدہ آیت ۹۲.

پھر اگر تم نے منہ پھیر لیا تو جان لو ہمارے رسول کی ذمہ داری تو بس واضح طور پر حکم پہنچا دینا ہے.

لہذا منصب رسالت ایک ایسا منصب ہے جو نبی کو عطا کیا جاتا ہے دوسرے لفظوں میں نبوت اور رسالت دونوں ہی الفاظ اس خصوصیت کی طرف اشارہ کرتے ہیں جو پیغمبروں میں پائی جاتی ہے اگر پیغمبر صرف وحی الٰہی کو لے کر پہنچا دے تو اسے نبی کہتے ہیں لیکن اگر وہ رسالت و شریعت بھی لوگوں تک پہنچائے تو اسے رسول کہا جاتا ہے.

۳۔ منصب امامت

قرآن مجید کی نظر میں منصب امامت، نبوت اور سالت کے علاوہ ایک تیسرا عہدہ ہے جس میں صاحب منصب کو لوگوں کی رہبری کے ساتھ ساتھ کچھ زیادہ تصرفات کا اختیار حاصل ہوتا ہے.

اب ہم قرآنی آیات کی روشنی میں اس موضوع کے بارے میں چند واضح دلائل پیش کرتے ہیں.

ا۔ قرآن کریم حضرت ابراہیم خلیلؑ کو منصب امامت عطا کرتے ہوئے فرماتا ہے:
)وَإِذِ ابْتَلَىٰ إِبْرَاهِيمَ رَبُّهُ بِكَلِمَاتٍ فَأَتَمَّهُنَّ قَالَ إِنِّي جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ إِمَامًا قَالَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِي)(۱(

)۱(سورہ بقرہ آیت: ۱۲۴.

اور (وہ وقت یاد کیجئے) جب ابراہیم کو ان کے رب نے چند کلمات کے ذریعہ آزمایا اور انہوں نے ان کو پورا کر دکھایا تو ارشاد ہوا میں تمہیں لوگوں کا امام بنا رہا ہوں انہوں نے کہا اور میری ذریت؟

قرآن مجید کی اس آیت سے دو حقیقتیں آشکار ہو جاتی ہیں:

الف: مذکورہ آیت بخوبی اس بات کی گواہی دے رہی ہے کہ منصب امامت، نبوت و رسالت کے علاوہ ایک تیسرا منصب ہے کیونکہ حضرت ابراھیمؑ ان آزمائشوں (منجملہ قربانی اسماعیل سے پہلے ہی) مقام نبوت پر فائز تھے یہ بات درج ذیل دلیل سے ثابت ہوتی ہے:

ہم سب یہ جانتے ہیں کہ خداوند عالم نے حضرت ابراہیمؑ کو بڑھاپے میں حضرت اسماعیلؑ و اسحاقؑ عطا فرمائے تھے قرآن مجید حضرت ابراہیمؑ کی زبان سے یوں حکایت کرتا ہے:

)الْحَمْدُ للهِ الَّذِي وَهَبَ لِي عَلَى الْكِبَرِ إِسْمَاعِيلَ وَإِسْحَاقَ)(۱(

شکر ہے اس خدا کا جس نے مجھے بڑھاپے میں اسماعیل واسحق عطا کئے.

اس سے معلوم ہو جاتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کی مذکورہ آزمائشوں میں سے ایک

)۱(سورہ ابراہیم آیت: ۳۹.

حضرت اسماعیلؑ کی قربانی بھی تھی اور اس مشکل آزمائش کے مقابلے میں انہیں منصب امامت عطا کیا گیا تھا نیز انہیں یہ منصب ان کی عمر کے آخری حصے میں عطا کیا گیا تھا. جبکہ وہ کئی سال پہلے ہی سے منصب نبوت پر فائز تھے کیونکہ حضرت ابراہیمؑ پر ان کی ذریت سے پہلے بھی وحی الٰہی (جو کہ نبوت کی نشانی ہے) نازل ہوا کرتی تھی(۱(

ب: اسی طرح اس آیت (وَإِذِ ابْتَلَى إِبْرَاهِيمَ رَبُّهُ بِكَلِمَاتٍ...) سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ امامت اور رہبری کا منصب نبوت ورسالت سے بالاتر ہے کیونکہ قرآن مجید کی گواہی کے مطابق خداوند کریم نے جناب ابراہیمؑ کو نبوت ورسالت کے عہدہ پر فائز ہونے کے باوجود جب انہیں امامت عطا کرنی چاہی تو انتہائی سخت قسم کے امتحان سے آزمایا تھا اور جب وہ اس امتحان میں کامیاب ہوئے تب اس کے بعد یہ منصب انہیں دیا تھا اس بات کی دلیل واضح ہے اس لئے کہ امامت کے فرائض میں وحی الٰہی کے حاصل کرنے اور رسالت وشریعت کے پہنچانے والے کے علاوہ امت کی رہبری اور ان کی ہدایت کرتے ہوئے انہیں کمال وسعادت کی راہ پر گامزن کرنا بھی شامل ہے اب یہ بات فطری ہے کہ وہ منصب ایک خاص قسم کی عزت وعظمت کا حامل ہوگا جس کا حصول انتہائی سخت آزمائشوں کے بغیر ممکن ہی نہ ہو .

۲۔ گذشتہ آیت سے بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ خداوند عالم نے سخت آزمائشوں

)۱(اس سلسلے میں سورہ صافات کی آیت نمبر ۹۹ سے لے کر ۱۰۲ تک اور سورہ حجر کی آیت نمبر ۵۳ اور ۵۴ اور سورہ ہود کی آیت ۷۰ اور ۷۱ کا مطالعہ فرمائیں. کے بعد جناب ابراہیمؑ کو امامت اور معاشرہ کی قیادت عطا فرمائی تھی اور اس وقت جناب ابراہیمؑ نے خدا سے درخواست کی تھی خدایا! اس منصب کو میری ذریت میں بھی قرار دینا اب قرآن مجید کی چند دوسری آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ پروردگار عالم نے جناب ابراہیمؑ کی یہ درخواست قبول کرلی تھی اور نبوت وامامت کے بعد امت کی رہبری اور حکومت کو جناب ابراہیمؑ کی نیک اور صالح ذریت میں بھی قرار دے دیا تھا. قرآن مجید اس سلسلے میں فرماتا ہے:

)فَقَدْ آتَيْنَا آلَ إِبْرَاهِيمَ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَآتَيْنَاهُم مُّلْكًا عَظِيمًا)(۱(

تو پھر ہم نے آل ابراہیم کو کتاب وحکمت عطا کی اور انکو عظیم سلطنت عنایت کی.

اس آیت سے یہ استفادہ ہوتا ہے کہ ''امامت'' نبوت، سے الگ ایک منصب ہے جسے خداوند عالم نے اپنے عظیم القدر نبی جناب ابراہیمؑ کو سخت آزمائشوں کے بعد عطا فرمایا تھا اور انہوں نے اس وقت خداوند عالم سے درخواست کی تھی کہ امامت کو میری ذریت میں بھی قرار دے تو خدائے حکیم نے ان کی یہ درخواست قبول فرمائی تھی اور انہیں آسمانی کتاب اور حکمت (جو کہ نبوت ورسالت سے مخصوص ہے) کے علاوہ ''ملک عظیم'' (یعنی لوگوں پر

حکومت) بھی عطا کی تھی.

)۱(سورہ نساء آیت ۵۴.

لہذا ہم دیکھتے ہیں کہ خداوند کریم نے جناب ابراہیمؑ کی ذریت کے بعض افراد (جیسے حضرت یوسفؑ حضرت داؤدؑ اور حضرت سلیمانؑ) کو منصب نبوت کے علاوہ حکومت کرنے اور لوگوں کی رہبری کے لئے بھی منتخب فرمایا تھا ان بیانات کی روشنی میں معلوم ہو جاتا ہے کہ امامت کا عہدہ نبوت ورسالت کے علاوہ ایک تیسرا منصب ہے جو کہ مزید قدرت اور ذمہ داریوں کی وجہ سے دوسرے عہدوں کی بہ نسبت زیادہ اہمیت کا حامل ہے.

منصب امامت کی برتری

گذشتہ بیانات سے واضح ہو جاتا ہے کہ نبی اور رسول کا کام صرف لوگوں تک پیغام پہنچانا اور انہیں راہ دکھانا ہے اور اگر کوئی نبی منصب امامت پر فائز ہو جاتا ہے تو اس کی ذمہ داری بڑھ جاتی ہے اور نتیجے میں معاشرے کو سنوارنے اور سعادت مند بنانے کے لئے شریعت کے احکامات کو نافذ کرنے کی ذمہ داری بھی اس کے دوش پر آجاتی ہے اس طرح وہ امت کو ایسے راستے پر گامزن کر دیتا ہے جس سے وہ دونوں جہان میں خوشبخت بن جاتی ہے.

واضح ہے کہ اس قسم کی اہم ذمہ داری ایک عظیم معنوی قدرت اور خاص لیاقت کی نیاز مند ہے اور اس سنگین عہدے کے لئے راہ خدا میں صبر اور ثبات قدم کی ضرورت ہے کیونکہ اس راہ میں ہمیشہ سخت مشکلات کا سامنا کرتے ہوئے خواہشات نفسانی سے نبرد آزما ہونا پڑتا ہے یہی وجہ ہے کہ عشق خدا اور رضائے پروردگار کے بغیر اس عظیم منصب کا حصول ممکن نہیں ہے ان ہی سب وجہوں سے خداوند عظیم نے جناب ابراہیمؑ کو ان کی عمر کے آخری حصے میں انتہائی سخت آزمائشوں کے بعد یہ منصب عطا کیا تھا اور پھر اپنے بہترین بندوں جیسے حضرت پیغمبر ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ منصب امامت ورہبری عنایت فرمایا تھا.

کیا نبوت اور امامت ایک دوسرے کے لئے لازم ملزوم ہیں؟

اس سوال سے ایک اور سوال بھی سامنے آتا ہے اور وہ یہ ہے کہ: کیا ہر نبی کے لئے امام ہونا اور ہر امام کے لئے نبی ہونا ضروری ہے؟

ان دو سوالوں کا جواب منفی ہے ہم اس جواب کو واضح کرنے کیلئے وحی الہی کا سہارا لیں گے وہ آیتیں جو طالوت اور ظالم جالوت کی جنگ کے سلسلے میں نازل ہوئی ہیں اس بات کو بیان کرتی ہیں کہ خداوند عالم نے حضرت موسیٰ کے بعد منصب نبوت کو بظاہر ''اشموئیل'' نامی شخص کو عطا فرمایا تھا اور ساتھ ہی ساتھ منصب امامت وحکومت کو جناب طالوتؑ کے سپرد کیا تھا اس قصے کی تفصیل یوں بیان کی گئی ہے:

حضرت موسیٰ کی وفات کے بعد بنی اسرائیل کے ایک گروہ نے اپنے زمانے کے پیغمبر سے کہا کہ ہمارے لئے ایک حکمران معین کیجئے تاکہ اس کی سربراہی میں ہم راہ خدا میں جنگ کریں تو اس وقت ان کے پیغمبر نے ان سے یوں کہا:

)وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ إِنَّ اللَّهَ قَدْ بَعَثَ لَكُمْ طَالُوتَ مَلِكًا قَالُوا أَنَّىٰ يَكُونُ لَهُ الْمُلْكُ عَلَيْنَا وَنَحْنُ أَحَقُّ بِالْمُلْكِ مِنْهُ وَلَمْ يُؤْتَ سَعَةً مِنَ الْمَالِ قَالَ إِنَّ اللَّهَ اصْطَفَاهُ عَلَيْكُمْ وَزَادَهُ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ وَاللَّهُ يُؤْتِي مُلْكَهُ مَنْ يَشَاءُ وَاللَّهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ(۱(

اوران کے پیغمبر نے ان سے کہا: اللہ نے طالوت کو تمہارے لئے بادشاہ مقرر کیا ہے. ان لوگوں نے کہا: اسے ہم پر بادشاہی کرنے کا حق کیسے مل گیا ہے؟ ہم خود بادشاہی کے اس سے زیادہ حق دار ہیں. وہ تو کوئی دولت مند آدمی نہیں ہے. نبی نے جواب دیا کہ اللہ نے اسے تمہارے لئے منتخب کیا ہے اور اسے علم اور جسمانی طاقت کی فراوانی سے نوازا ہے اور اللہ جسے چاہتا ہے اپنا ملک دے دیتا ہے اور اللہ بڑا وسعت والا، دانا ہے.

اس آیت سے درج ذیل باتیں سامنے آتی ہیں:

۱۔ یہ ممکن ہے کہ کچھ مصلحتیں اس بات کا تقاضا کریں کہ منصب نبوت کو منصب امامت سے جدا کر دیا جائے اور ایک ہی زمانے میں دو الگ الگ افراد نبی و امام ہوں اور ان میں سے ہر ایک اپنے خاص منصب ہی کی لیاقت و صلاحیت رکھتا ہو.

اسی لئے بنی اسرائیل نے اپنے زمانے میں ان دو منصبوں کے جدا ہونے پر کوئی اعتراض نہیں کیا تھا کہ اے پیغمبر آپ طالوت سے زیادہ حکومت کے حقدار ہیں. بلکہ

)۱(سورہ بقرہ آیت ۲۴۷.

انہوں نے یہ اعتراض کیا تھا کہ ہم اس سے زیادہ حکومت کے حقدار ہیں.

۲۔ جناب طالوتؑ کو حکومت خداوند کریم ہی نے عطا کی تھی قرآن مجید اس سلسلے میں فرماتا ہے:

)اِنَّ اللہَ قَدْ بَعَثَ لَکُمْ طَالُوتَ مَلِکًا) اللہ نے طالوت کو تمہارے لئے بادشاہ مقرر کیا ہے اور یہ بھی ارشاد ہوتا ہے (اِنَّ اللہَ اصْطَفَاہُ عَلَیْکُمْ) بے شک اللہ نے اسے تمہارے لئے منتخب کیا ہے .

۳۔ جناب طالوت کا یہ الٰہی منصب صرف فوج کی سربراہی تک محدود نہیں تھا بلکہ وہ بنی اسرائیل کے حاکم و فرمانروا بھی تھے کیونکہ قرآن نے انہیں "مَلِکًا" کہہ کر یاد کیا ہے اگرچہ اس دن اس رہبری کا مقصد یہ تھا کہ جہاد کرنے کے لئے بنی اسرائیل کی سربراہی کریں لیکن ان کا یہ الٰہی منصب انہیں دوسری حکومتی ذمہ داریوں کو بھی انجام دینے کی اجازت دیتا تھا.

اس لئے قرآن مجید اس آیت کے اختتام میں فرماتا ہے:

)وَاللہُ یُؤْتِی مُلْکَہُ مَنْ یَشَاءُ) اور اللہ جسے چاہے اپنا ملک دیدے.

۴۔ امت کی رہبری اور امامت کے لئے اہم ترین شرط یہ ہے کہ اس میں علمی، جسمانی، اور معنوی توانائی پائی جاتی ہو اس قسم کی صلاحیت اس زمانے میں زیادہ اہمیت رکھتی تھی کیونکہ ان ایام میں حاکم خود میدان میں حاضر ہو کر جنگ کرتا تھا(۱(

)۱(منشور جاوید (مصنفہ استاد جعفر سبحانی) سے ماخوذ.

گذشتہ بیانات سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ نبوت اور امامت ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم نہیں ہیں بلکہ ممکن ہے کہ ایک شخص نبی تو ہو لیکن منصب امامت پر فائز نہ ہو یا یہ کہ کوئی شخص خدا کی جانب سے امام تو ہو لیکن اسے عہدۂ نبوت حاصل نہ ہوا ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ پروردگار عالم یہ دونوں منصب ایک ہی شخص کو عطا کر دے جیسا کہ قرآن مجید فرماتا ہے:

)فَهَزَمُوهُم بِإِذْنِ اللهِ وَقَتَلَ دَاوُودُ جَالُوتَ وَآتَاهُ اللهُ الْمُلْكَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَهُ مِمَّا يَشَاءُ)(١(

چنانچہ اللہ کے اذن سے انہوں نے جالوت کے لشکر کو شکست دے دی اور داؤد نے جالوت کو قتل کر دیا اور اللہ نے انہیں سلطنت و حکمت عطا فرمائی اور جو کچھ چاہا انہیں سکھا دیا.

)١(سورہ بقرہ آیت ٢٥١.

چھتیسواں سوال

توحید اور شرک کی شناخت کا معیار کیا ہے؟

''توحید'' اور شرک کی بحثوں میں سب سے اہم مسئلہ ان دونوں کی شناخت کے معیار کا ہے اور جب تک یہ مسئلہ حل نہیں ہوگا بعض دوسرے اہم مسائل بھی حل نہیں ہو پائیں گے اس لئے ہم مسئلہ توحید و شرک پر مختلف زاویوں سے مختصراً بحث پیش کر رہے ہیں:

۱۔ توحید ذاتی

توحید ذاتی دو صورتوں میں پیش کی جاتی ہے:

الف: خدا ایک ہے اور کوئی اس جیسا نہیں (اس مفہوم کو علم کلام کے علماء واجب الوجود کے نام سے یاد کرتے ہیں) اور یہ وہی توحید ہے کہ جسے خداوند عالم نے مختلف صورتوں میں قرآن مجید میں ذکر فرمایا ہے ملاحظہ ہو:

)لیس کمثلہ شیء (

اس جیسی کوئی چیز نہیں ہے.(۱(

ایک اور جگہ پر فرماتا ہے:

)ولم یکن لہ کفواً أحد)(۲(

اور کوئی بھی اس کا کفو اور ہمسر نہیں ہے.

البتہ بعض اوقات توحید کی اس قسم کی تفسیر عامیانہ طور پر کر دی جاتی ہے کہ جس میں توحید عددی کا رنگ دکھائی دینے لگتا ہے وہ اس طرح کہ: کہا جاتا ہے کہ خدا ایک ہے اور دو نہیں اس قسم کا جملہ سن کر کچھ کہے بغیر واضح ہو جاتا ہے کہ خدا کی طرف اس قسم کی توحید (عددی) کی نسبت دینا صحیح نہیں ہے.

ب: خدا کی ذات بسیط ہے نہ کہ مرکب کیونکہ ہر مرکب موجود (چاہے اس کا وجود ذہنی اجزاء سے مرکب ہو یا خارجی اجزاء سے مرکب ہو) اپنے وجود میں اجزاء کا محتاج ہوتا ہے اور محتاج ہونا ممکن ہونے کی علامت ہے اور ہر ممکن علت کا محتاج ہوتا ہے. اور یہ سب کچھ واجب الوجود کے ساتھ کسی بھی صورت میں مطابقت نہیں رکھتا.

۲۔ خالقیت میں توحید

توحید کے وہ مراتب جنہیں عقل و نقل دونوں نے قبول کیا ہے ان میں سے ایک توحید خالقیت بھی ہے عقل کی رو سے خداوند عالم کے علاوہ جو کچھ بھی ہے

وہ سب عالم

)۱(سورہ شوریٰ آیت: ۱۱.

)۲(سورہ اخلاص آیت: ۴.

امکان کے زمرے میں آتا ہے اور ہر قسم کے جمال و کمال سے عاری ہوتا ہے اور جو کچھ عالم امکان میں پایا جاتا ہے وہ غنی بالذات (خدا) کی بے کراں رحمتسے فیض یاب ہوتا ہے اس اعتبار سے اس دنیا میں دکھائی دینے والے جمال و کمال کے جلوے اسی کے مرہون منت ہوتے ہیں قرآن مجید نے بھی توحید خالقیت کے سلسلے میں بہت سی آیات پیش کی ہیں ہم ان میں سے صرف ایک آیت کی طرف اشارہ کرتے ہیں:

) قُلِ اللّٰہُ خَالِقُ کُلِّ شَیْءٍ وَہُوَ الْوَاحِدُ الْقَہَّارُ)(۱(

کہہ دیجئے: ہر چیز کا خالق صرف اللہ ہے اور وہ یکتا، بڑا غالب ہے.

لہذا خدا پرستوں میں مجموعی طور پر توحید خالقیت کے سلسلے میں اختلاف نہیں پایا جاتا ہے صرف اتنا فرق ہے کہ توحید خالقیت کے بارے میں دو قسم کی تفسیریں پائی جاتی ہیں ان دونوں کو ہم یہاں بیان کرتے ہیں:

الف: موجودات عالم میں پائے جانے والے ہر قسم کی علت اور معلول والے نظام اور نیز ان کے درمیان پائے جانے والے سبب اور مسبب کے رابطے سب ہی علۃ العلل (جس کی کوئی علت نہ ہو) اور مسبب الاسباب (جس کا کوئی سبب نہ ہو) تک پہنچتے ہیں اور در حقیقت اصلی اور مستقل خالق خداوند عالم ہی کی ذات ہے اور خدا کے علاوہ باقی سب علل و اسباب، خداوند عالم کی اجازت و مشیت کے تابع ہیں.

اس نظریہ میں دنیا میں علت و معلول کے نظام کا اعتراف کیا گیا ہے. اور علم بشر

)۱(سورہ رعد آیت: ۱۶.

نے بھی اس کو تسلیم کیا ہے لیکن اس کے باوجود کل نظام کا تعلق ایک لحاظ سے خدا ہی سے ہے اور اسی نے اسباب کو سببیت، علت کو علیت اور موثر کو تاثیر عطا کی ہے.

ب: اس دنیا میں صرف ایک ہی خالق کا وجود ہے اور وہ خداوند عالم کی ذات ہے اور نظام ہستی میں اشیاء کے درمیان ایک دوسرے کیلئے کسی قسم کی اثر گزاری اور اثر پذیری نہیں پائی جاتی بلکہ تمام مادی موجودات کا خالق بلا واسطہ خدا ہی ہے. اسی طرح انسان کی طاقت بھی اس کے اعمال پر اثر انداز نہیں ہوتی ہے. لہذا نظام ہستی میں صرف ایک ہی علت پائی جاتی ہے اور وہی ان فطری علتوں کی رئیس و اصل ہے.

البتہ توحید خالقیت کی یہ تفسیر اشاعرہ نے پیش کی ہے لیکن ان میں سے بعض افراد جیسے امام الحرمین (۱) اور شیخ محمد عبدہ نے رسالہ توحید میں اس تفسیر کو چھوڑ کر پہلی تفسیر کو مانا ہے.

۳۔ تدبیر میں توحید

چونکہ عالم کو خلق کرنا خدا ہی سے مخصوص ہے لہذا نظام ہستی کی تدبیر بھی اسی کے ہاتھ میں ہے اور اس دنیا میں صرف ایک ہی مدبر کا وجود ہے اور وہ عقلی دلیل کہ جو توحید خالقیت کو ثابت کرتی ہے وہی دلیل تدبیر میں بھی توحید کو ثابت کرتی ہے.

قرآن مجید کی متعدد آیات نے خداوند عالم کے مدبر ہونے کو بیان کیا ہے اس سلسلے میں یہ آیت ملاحظہ ہو:

)۱(ملل و نحل (شہرستانی) جلد ۱.

)أَغَيْرَ اللهِ أَبْغِي رَبًّا وَهُوَ رَبُّ كُلِّ شَيْءٍ()۱(

کہہ دیجئے: کہ کیا میں خدا کے علاوہ کوئی اور رب تلاش کروں جب کہ وہ ہر چیز کا رب ہے.

البتہ وہ دونوں تفسیریں جو توحید خالقیت میں پائی جاتی ہیں وہی توحید تدبیری میں بھی پائی جاتی ہیں اور ہمارے عقیدے کے مطابق توحید تدبیری سے مراد یہ ہے کہ مستقل طور پر تدبیر کرنا صرف خدا سے مخصوص ہے

اس بنیاد پر نظام ہستی کے موجودات کے درمیان بعض تدبیریں خدا کے ارادے اور مشیت سے وجود میں آتی ہیں قرآن مجید نے بھی حق سے متمسک مدبروں کے بارے میں یوں فرمایا ہے:

)فالمدبرات امراً()۲(

پھر امر کی تدبیر کرنے والے ہیں.

۴۔ حاکمیت میں توحید

حاکمیت میں توحید سے مراد یہ ہے کہ حکومت کا حق فقط خداوند عالم کو ہے اور صرف وہی انسانوں پر حاکم ہے جیسا کہ قرآن مجید فرماتا ہے:

)۱(سورہ انعام آیت: ۱۶۴.

)۲(سورہ نازعات آیت: ۵.

)اِنِ الْحُكْمُ اِلا للهِ()۱(

حکم کرنے کا حق صرف خدا کو ہے.

اس اعتبار سے خدا کے علاوہ کسی اور کی حکومت صرف خدا کے ارادے اور مشیت سے ہونی چاہیے تاکہ نیک اور صالح افراد ہی معاشرے کے امور کی باگ ڈور سنبھالیں اور لوگوں کو کمال و سعادت کی راہ پر گامزن کر سکیں جیسا کہ قرآن مجید فرماتا ہے:

)يَادَاوُودُ اِنَّا جَعَلْنَاكَ خَلِيفَةً فِي الْاَرْضِ فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ()۲(

اے داؤد ہم نے آپ کو زمین پر اپنا جانشین بنایا ہے لہذا آپ لوگوں کے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ کریں.

۵۔اطاعت میں توحید

اطاعت میں توحید سے مراد یہ ہے کہ حقیقی اور ذاتی طور پر خدائے بزرگ کی پیروی ضروری ہے لہذا بعض دوسرے افراد (جیسے پیغمبر، امام، فقیہ، باپ اور ماں) کی اطاعت کا لازم ہونا پروردگار عالم کے حکم اور ارادے سے ہے .

۶۔شریعت قرار دینے اور قانون گزاری میں توحید

قانون گزاری میں توحید سے مراد یہ ہے کہ شریعت قرار دینے اور قانون گزاری

)۱(سورہ یوسف آیت: ۴۰.

)۲(سورہ ص آیت ۲۶.

کا حق فقط خداوند عالم کو ہے اسی بنیاد پر قرآن مجید ہر اس حکم کو جو حکم الٰہی کے دائرے سے خارج ہو اسے کفر، فسق اور ظلم کا سبب قرار دیتا ہے ملاحظہ ہو:

)وَمَنْ لَمْ يَحْكُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ فَأُولَئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ)(۱(

اور جو لوگ بھی خدا کے نازل کردہ حکم کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہ ظالم ہیں.

)وَمَنْ لَمْ يَحْكُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ فَأُولَئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ)(۲(

اور جو لوگ اللہ کے نازل کردہ حکم کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہ فاسق ہیں.

)وَمَنْ لَمْ يَحْكُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ فَأُولَئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ)(۳(

اور جو لوگ اللہ کے نازل کردہ حکم کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہ ظالم ہیں.

)۱(سورہ مائدہ آیت: ۴۴.

)۲(سورہ مائدہ آیت: ۴۷.

)۳(سورہ مائدہ آیت ۴۵.

۷۔عبادت میں توحید

عبادت میں توحید کے سلسلے میں اہم ترین بحث ''عبادت'' کے معنی کی شناخت ہے کیونکہ سب مسلمان اس بات پر اتفاق رکھتے ہیں کہ عبادت صرف خدا سے مخصوص ہے اور اس کے علاوہ کسی اور کی پرستش نہ کی جائے جیسا کہ قرآن مجید اس سلسلے میں فرماتا ہے:

)إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ)(۱(

ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھی سے مدد مانگتے ہیں.

قرآن مجید کی مختلف آیات سے یہ استفادہ ہوتا ہے کہ تمام انبیاء کی دعوتوں کا بنیادی عنصر یہی عقیدہ تھا قرآن مجید اس سلسلے میں فرماتا ہے:

)وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِي كُلِّ أُمَّةٍ رَسُولاً أَنْ اُعْبُدُوا اللهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوتَ)(۲(

اور یقیناً ہم نے ہر امت میں ایک رسول بھیجا تاکہ تم لوگ اللہ کی عبادت کرو اور طاغوت کی بندگی سے اجتناب کرو.

لہذا اس مسلم الثبوت اصل میں کوئی شک نہیں کہ عبادت کا حق صرف خدا کا ہے اور اس کے سوا کسی اور کی عبادت نہیں کی جاسکتی نیز یہ کہ اس اصل پر ایمان نہ رکھنے والا

)۱(سورہ حمد آیت: ۴.

)۲(سورہ نحل آیت: ۳۶.

موحد نہیں ہو سکتا.

لیکن ہماری گفتگو اس سلسلے میں ہے کہ ''عبادت'' اور غیر عبادت کی شناخت کا معیار کیا ہے؟

مثال کے طور پر اگر کوئی شخص اپنے استاد اور ماں باپ یا علماء اور مجتہدین کے ہاتھوں کا بوسہ لے یا اپنے ذوی الحقوق کا احترام کرے تو کیا اس کا یہ عمل ان کی عبادت شمار ہوگا؟ یا ایسا نہیں ہے بلکہ کسی کے مقابلے میں خضوع و خشوع کو عبادت نہیں کہتے بلکہ عبادت کے لئے ایک خاص صفت کا ہونا ضروری ہے ورنہ اس کے بغیر چاہے جس بھی طرح کا خضوع ہو عبادت نہیں کہلائے گا اب دیکھنا یہ ہے کہ وہ کونسی بنیادی صفت ہے جو کسی بھی طرح کے خضوع کو عبادت بنا سکتی ہے؟

لفظ عبادت کے غلط معنی

کچھ مصنفین نے اپنی کتابوں میں عبادت کے معنی خضوع اور یا زیادہ خضوع بیان کئے ہیں لیکن ان مصنفین کو قرآن مجید کی بعض آیات کے ترجمہ میں مشکل پیش آتی ہے کیونکہ ان آیتوں میں خداوند کریم نے صراحت سے یہ بیان کیا ہے کہ اس نے فرشتوں کو جناب آدمؑ کا سجدہ کرنے کا حکم دیا تھا ملاحظہ ہو:

)وَإِذْ قُلْنَا لِلْمَلَائِكَةِ اسْجُدُوا لِآدَمَ)(۱(

)۱(سورہ بقرہ آیت: ۳۴.

اور اس وقت کو یاد کرو جب ہم نے فرشتوں سے کہا: آدم کو سجدہ کرو.

حضرت آدمؑ کے لئے بعینہ اسی طرح سجدہ بجالایا گیا جس طرح خداوند کریم کے لئے سجدہ کیا جاتا تھا جبکہ جناب آدمؑ کے سامنے یہ سجدہ خضوع اور تواضع کے اظہار کی خاطر انجام پایا تھا اور خدا کا سجدہ عبادت و پرستش کے طور پر بجالایا جاتا ہے اب دیکھنا یہ ہے کہ یہ ایک ہی طرح کے سجدوں میں کیسے دو مختلف

حقیقتیں پیدا ہو گئیں؟

قرآن مجید ایک اور جگہ فرماتا ہے کہ جناب یعقوبؑ نے اپنے بیٹوں کے ہمراہ جناب یوسفؑ کے سامنے سجدہ کیا تھا:

)وَرَفَعَ اَبَوَیہِ عَلَی العَرشِ وَ خَرُّوالَہ سُجَّدًا وَقَالَ یَا اَبَتِ ہٰذَا تَاوِیلُ رُءیَایَ مِن قَبلُ قَدجَعَلَہَا رَبِّی حَقًّا"(۱(

اور یوسف نے اپنے والدین کو تخت پر بٹھایا اور وہ سب انکے سامنے سجدے میں گر پڑے اور یوسفؑ نے کہا: اے باباجان! یہی میرے پہلے خواب کی تعبیر ہے بے شک میرے رب نے اسے سچ کر دکھایا ہے.

یہاں پر اس نکتے کا ذکر ضروری ہے کہ جناب یوسفؑ نے پہلے خواب کی طرف اشارہ کیا تھا جس سے مراد وہی خواب تھا جس میں انہوں نے دیکھا تھا کہ چاند اور

)۱(سورہ یوسف آیت:۱۰۰.

سورج کے ہمراہ گیارہ ستارے ان کے سامنے سجدہ ریز ہیں اس بات کو قرآن مجید نے یوں نقل کیا ہے:

)اِنِّی رَاَیتُ اَحَدَ عَشَرَ کَوکَبًا وَالشَّمسَ وَالقَمَرَ رَاَیتُہُم لِی سَاجِدِینَ)(۱(

میں نے خواب میں گیارہ ستاروں اور آفتاب و مہتاب کو دیکھا ہے کہ یہ میرے سامنے سجدہ کر رہے ہیں.

اس آیت میں گیارہ ستاروں سے جناب یوسفؑ کے گیارہ بھائی اور چاند اور سورج سے ان کے ماں اور باپ مراد ہیں.

اس بیان سے واضح ہو جاتا ہے کہ نہ صرف حضرت یعقوبؑ کے بیٹوں نے بلکہ خود جناب یعقوبؑ نے بھی جناب یوسفؑ کے سامنے سجدہ کیا تھا.

اب یہاں ہم یہ سوال کرنا چاہتے ہیں:

اس قسم کے سجدہ کو عبادت میں شمار کیوں نہیں کیا جاتا جبکہ سجدہ نہایت خضوع اور تواضع کے ساتھ بجالایا گیا تھا؟

عذر بدتر از گناہ

یہاں پر چونکہ مذکورہ مصنفین اس سوال کا جواب نہیں دے پائے لہذا یوں کہتے ہیں:

)۱(سورہ یوسف آیت:۴.

چونکہ اس قسم کا خضوع و خشوع پروردگار عالم کے حکم سے انجام دیا گیا تھا لہذا اسے شرک شمار نہیں کیا جاسکتا. لیکن یہ بات معلوم ہے کہ ان کی یہ تاویل کسی بھی اعتبار سے صحیح نہیں ہے اس لئے کہ اگر کوئی عمل باعث شرک ہو تو خداوند عالم ہر گز اس کا حکم نہیں دے سکتا.

قرآن مجید فرماتا ہے:

) قُل اِنَّ اللہَ لَایَامُرُ بِالفَحشَاءِ اَتَقُولُونَ عَلَی اللہِ مَالَا تَعلَمُون)(۱(

کہہ دیجئے اللہ یقیناً برائی کا حکم نہیں دیتا. کیا تم اللہ کے بارے میں ایسی باتیں کرتے ہو جن کا تمہیں علم ہی نہیں؟

اصولی طور پر خداوند عالم کا حکم کسی چیز کی حقیقت کو نہیں بدلتا اگر ایک انسان کے مقابلے میں خضوع کرنا اس کی عبادت ہو اور خدائے بزرگ نیز اس کا حکم دے تو اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ خدا اپنی عبادت کا حکم دے رہا ہے.

مسئلے کا جواب اور عبادت کے حقیقی معنی کی وضاحت

یہاں تک یہ واضح ہو گیا کہ ''غیر خدا کی عبادت کے ممنوع ہونے کے سلسلے میں'' دنیا کے تمام موحد متفق ہیں اور دوسری طرف سے یہ بھی روشن ہو چکا ہے کہ فرشتوں کا

)۱(سورہ اعراف آیت: ۲۸.

حضرت آدمؑ کے سامنے اور حضرت یعقوبؑ اور ان کے بیٹوں کا حضرت یوسفؑ کے سامنے سجدہ کرنا ان کی عبادت نہ تھا اب ضروری ہے کہ ہم اس نکتے کی طرف توجہ دلائیں کہ وہ کون سی خاص صفت ہے جس کے نہ ہونے سے ایک عمل عبادت نہیں بن پاتا جبکہ اگر وہ پائی جاتی ہو تو وہی عمل عبادت شمار ہوتا ہے.

قرآنی آیات کی روشنی میں واضح ہو جاتا ہے کہ کسی موجود کو خدا سمجھ کر اس کے سامنے خضوع کرنا یا اس کی طرف خدائی امور کی نسبت دینا اس کی عبادت کہلاتا ہے اس بیان سے بخوبی معلوم ہو جاتا ہے کہ اگر کسی کو خدائی امور انجام دینے پر قادر سمجھتے ہوئے اس کے سامنے خضوع کیا جائے تو یہ عمل اسی کی عبادت شمار ہو گا. دنیا کے مشرک ایسے موجودات کے سامنے خضوع کیا کرتے تھے کہ جنہیں وہ مخلوق خدا تو سمجھتے تھے لیکن وہ اس بات کے معتقد تھے کہ کچھ خدائی امور جیسے کہ گناہوں کی بخشش،

اور حق شفاعت انہیں موجودات کو سونپ دیئے گئے ہیں.

سرزمین بابل کے کچھ مشرک آسمانی ستاروں کو اپنا رب اور دنیا اور انسانوں کی تدبیر کا مالک سمجھ کر ان کی عبادت کرتے تھے لیکن انہیں اپنا خالق نہیں سمجھتے تھے حضرت ابراہیمؑ نے بھی اسی اصل کی بنا پر اپنی قوم کے ساتھ مناظرہ کیا تھا کیونکہ سرزمین بابل کے مشرک ہرگز سورج چاند اور ستاروں کو اپنا خالق نہیں سمجھتے تھے بلکہ وہ انہیں ایسی باقدرت مخلوق سمجھتے تھے جنہیں ربوبیت اور دنیا کی تدبیر سونپ دی گئی تھی قرآنی آیات میں بھی حضرت ابراہیمؑ اور مشرکین بابل کے درمیان مناظرے میں لفظ رب کو محور قرار دیتے ہوئے(۱) بیان کیا گیا ہے اور یہ واضح ہے کہ لفظ رب کے معنی یہ ہیں کہ کسی کو اپنا صاحب اور اپنی مملوک کے امور کا مدبر قرار دیا جائے. عربی زبان میں گھر کے مالک کو'' رب البیت''اور کھیتی باڑی کے مالک کو رب الضیعہ کہتے ہیں اس لئے کہ گھر اور کھیتی باڑی کی تدبیر ان کے مالکوں کے ذمے ہوتی ہے.

قرآن مجید مشرکین کے مقابلے میں صرف خداوند عالم کو اس نظام ہستی کا رب اور مدبر قرار دیتا ہے اور سب کو خدائے یگانہ کی پرستش کی دعوت دیتے ہوئے فرماتا ہے:

)إِنَّ اللَّهَ رَبِّي وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوهُ هَذَا صِرَاطٌ مُسْتَقِيمٌ(۲(

اللہ میرا رب اور تمہارا بھی رب ہے لہذا اس کی عبادت کرو کہ یہی سیدھا راستہ ہے.

ایک اور جگہ فرماتا ہے:

)ذَٰلِكُمُ اللَّهُ رَبُّكُمْ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ فَاعْبُدُوهُ)(۳(

وہی اللہ تمہارا پروردگار ہے جس کے علاوہ کوئی معبود نہیں وہ ہر چیز کا خالق ہے لہذا اس کی عبادت کرو.

)۱(سورہ انعام آیت ۷۶ تا ۷۸.

)۲(سورہ آل عمران آیت ۵۱.

)۳(سورہ انعام آیت: ۱۰۲.

اس طرح قرآن مجید سورۂ دخان میں فرماتا ہے:

)لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ يُحْيِي وَيُمِيتُ رَبُّكُمْ وَرَبُّ آبَائِكُمُ الْأَوَّلِينَ)(۱(

اس کے سوا کوئی معبود نہیں وہی زندگی اور موت دیتا ہے وہی تمہارا رب ہے اور تمہارے پہلے آباؤاجداد کا بھی رب ہے.

اسی طرح قرآن مجید نے حضرت عیسیٰؑ کے قول کو یوں نقل کیا ہے:

)وَقَالَ الْمَسِيحُ يَا بَنِي إِسْرَائِيلَ اعْبُدُوا اللَّهَ رَبِّي وَرَبَّكُمْ)(۲(

اور مسیح نے کہا: اے بنی اسرائیل تم اللہ ہی کی عبادت کرو جو میرا اور تمہارا رب ہے.

گذشتہ بیانات کی روشنی میں واضح ہو جاتا ہے کہ ہر وہ خضوع جو کسی مخلوق کے سامنے اسے رب اور خدا سمجھے بغیر یا اس کی طرف خدائی امور کی نسبت دیئے بغیر انجام دیا جائے وہ ہر گز عبادت شمار نہیں کیا جاسکتا اگرچہ یہ خضوع حد سے زیادہ ہی کیوں نہ ہو جائے اس اعتبار سے امت کا پیغمبر اکرمؐ یا اپنے والدین کے سامنے انہیں خدا اقرار نہ دیتے ہوئے خضوع و خشوع کرنا ہر گز ان کی عبادت شمار نہیں کیا جاسکتا. اسی بنیاد پر بہت

)۱(سورہ دخان آیت ۸

)۲(سورہ مائدہ آیت: ۷۲.

سے موضوعات جیسے اولیائے الٰہی سے منسوب چیزوں کو متبرک سمجھنا، حرم کے دروازوں، دیواروں اور ضریحوں کو چومنا، خدا کی بارگاہ میں اولیائے الٰہی سے متوسل ہونا، اولیائے الٰہی کو پکارنا، ان کے ایام ولادت میں جشن منانا اور محفلیں برپا کرنا اور ان کے ایام وفات و شہادت میں مجلسیں منعقد کرنا ہر گز اولیائے الٰہی کی عبادت شمار نہیں کیا جاسکتا اگرچہ بعض ناآگاہ افراد ان کاموں کو غیر خدا کی عبادت اور شرک سمجھتے ہیں جبکہ ان سارے کاموں کو کسی بھی طرح سے غیر خدا کی عبادت اور شرک شمار نہیں کیا جاسکتا ہے۔